طبع اول : نومبر ۱۹۶۹ء

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : سید امتیاز علی تاج ، ستارہ امتیاز
ناظم ، مجلس ترقیِ ادب ، لاہور

طابع : ایس ایم شفیق

مطبع : شفیق پریس کبیر سٹریٹ ۔ لاہور

سر ورق وغیرہ : مطبع عالیہ ۵/۱۲۰ ٹمپل روڈ ، لاہور

قیمت : بارہ روپے

بعونِ صانعِ زمین و مکان و بفضلِ خلاقِ زمین و زمان

مجلس ترقی ادب ۲ - نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم

کے نام

جن کی دلی آرزو تھی

کہ

اُردو کے مقبول و معروف ڈرامے مرتب ہو کر مجلس کی جانب

سے شائع ہوں اور جن کے

مخلصانہ اصرار نے اس کام کو شروع کرنے کی تحریک کی

بمبئی کا ابتدائی اردو ڈراما

خورشید

جلد اوّل

فہرست

ضمیمہ جات

پیش لفظ

اُردو کی ایک بھی ایسی تاریخ اب تک مرتب نہیں ہوئی جس میں ڈرامے کی صنف پر اہم اور صحیح معلومات با ترتیب درج کی گئی ہوں اور جن پر غور کرنے کے بعد طلبا ان سے مناسب استفادہ کر سکیں۔ اور یہ صورت پیدا بھی کیوں کر ہو سکتی تھی، اُردو ڈرامے کے صحیح متن ہی آج تک کہیں سے شائع نہیں ہوئے۔ تقسیم ملک سے پیشتر بعض غیر ذمہ دار ناشروں کے شائع کیے ہوئے ادنٰی قسم کے جو ڈرامے بازار سے دستیاب ہو جاتے تھے، اب وہ بھی نایاب ہو چکے ہیں۔ ایسی صورت میں اُردو ڈرامے کی تاریخ و تنقید کے متعلق طلبا کے لیے صحیح و مربوط معلومات حاصل کرنا اور کوئی واضح رائے قائم کرنا ممکن نہیں تھا۔

میں مجلس ترقی ادب لاہور کا ممبر نامزد ہوا تو مجلس کے بورڈ میں زیادہ اہم اور ضروری کتابیں شائع کرنے کے متعلق غور کیا گیا۔ اِس موقعے پر میں نے اردو کے مقبول و معروف ڈراموں کے متون بہ احتیاط مرتب کرکے مع حواشی شائع کرنے کی تجویز پیش کی اور چونکہ اردو کے سارے اہم ڈرامے فراہم کرنا اب بہت دشوار تھا، اس لیے ساتھ ہی اِس بات کا اندیشہ بھی ظاہر کیا کہ اس طرف اگر اب بھی توجہ نہ کی گئی تو امریکہ کے گم شدہ ابتدائی ڈراموں کی طرح غالباً ہمیں بھی اپنے اکثر

ڈراموں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جانا پڑے گا ۔

مجلس کے صدر جسٹس ایس اے رحمان صاحب نے میری تجویز کو پسند فرما کر یہ کام میرے ہی سپرد کر دیا ۔ میرے محترم دوست خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کو گہری دلچسپی اگرچہ فلسفے اور شعر سے تھی لیکن اردو ڈرامے کے متعلق میری تجویز پر انھوں نے ہمدردانہ غور کر کے فرمایا کہ مجلس ترقی ادب اگر انھیں مرتب کرنے کا بیڑا اٹھائے اور یہ خدمت سرانجام دینے میں کامیاب ہوجائے تو یہ ایک یادگار کارنامہ ہوگا ۔ اِس کے بعد انھوں نے معمول بنا لیا کہ دفتر آتے جاتے ذرا سی دیر کے لیے روزانہ میرے ہاں تشریف لاتے اور یہ کام جلد سے جلد شروع کرنے کی تاکید مجھے کرتے ۔

میں نے مجلس کے بورڈ میں ڈرامے شائع کرنے کی تجویز جوش میں آکر پیش تو کر دی تھی لیکن اب اِس کام کو عملی طور سے شروع کرنے پر غور کیا تو طرح طرح کی مشکلات نظر آئیں ۔ اول تو میرے پاس وہ سب ڈرامے نہیں تھے جو شائع ہونے ضروری تھے ۔ جو تھے، اُن میں سے بیشتر کی عبارت غلطیوں سے بھری ہوئی تھی اور متن کی تصحیح کے لیے میرے پاس اُن کے مختلف اڈیشن موجود نہ تھے ۔ پھر اکثر ڈراموں پر اُن کے مصنف کا نام بھی درج نہ تھا ۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ بعض مقبول ڈراموں کو کمپنی کے مالکوں نے مقبول تر بنانے کے لیے مختلف زمانوں میں مختلف مصنفوں سے از سر نو لکھوایا مگر اس کے متعلق صحیح معلومات پاکستان میں بیٹھ کر فراہم کرنا کچھ آسان نہ تھا ۔

خوش قسمتی سے اِسی زمانے میں میرے نہایت عزیز دوست راجہ غضنفر علی خاں مرحوم بھارت میں پاکستان کے ہائی کمشنر

مقرر ہوگئے ۔ انھوں نے مجھے کچھ تعارفی خطوط عنایت فرما دیے جنھیں لے کر بھارت کے بعض ایسے شہروں کا سفر کرنے میں میرے لیے سہولت پیدا ہوگئی جو ڈرامے سے کسی طرح کی نسبت رکھتے تھے ، چنانچہ مجھے کئی بہت ضروری اور اہم معلومات حاصل ہو گئیں ۔

لیکن انتہائی کوشش کے باوجود اردو میں پوری طوالت کا پہلا کھیل "خورشید" مجھے کہیں سے دستیاب نہ ہوسکا چنانچہ پہلی جلد مکمل نہ ہو سکی اور اس کی وجہ سے اگلی پانچ جلدیں بھی جو چھپ کر تیار ہو چکی تھیں ، شائع نہ کی جاسکیں ۔ ڈراما "خورشید" تلاش کرنے میں کئی حضرات نے میری بے حد مدد فرمائی جن میں سے کوئٹے کے مشہور پارسی تاجر مسٹر مارکر اور اپنے عزیز مرحوم دوست رئیس احمد جعفری کا میں خصوصیت سے شکر گزار ہوں ۔ ڈراما مہیا کرنے میں یہ حضرات عرصے تک نہ صرف گہری دلچسپی لیتے رہے بلکہ اپنی کوششوں کے نتائج سے مجھے اطلاع بھی بخشتے رہے ۔

لیکن بالآخر اس کھیل کو مہیّا کرنے کا سہرا جناب نائب حسین نقوی کے سر رہا ۔ بھارت کے کئی شہروں کی لائبریریوں اور تاجران کتب کی دکانوں میں ناکام تلاش کے بعد انھوں نے بمبئی کا سفر کیا اور وہاں تلاش میں طرح طرح کی زحمتیں برداشت کرنے کے بعد یہ ڈراما حاصل کیا اور مجھے بہم پہنچا کر مجھے اور مجلس کو دلی احسان مندی کا موقع بخشا ۔

یہ اردو ڈراما کسی زمانے میں گجراتی رسم الخط میں شائع ہوا تھا ۔ نقوی صاحب نے ایک گجراتی دان کی امداد سے اسے اردو رسم الخط میں منتقل کرنے کی زحمت بھی برداشت

کی لیکن چونکہ ڈرامے کی زبان میں بعض مقامات پر غیرمعمولی اجنبیت تھی اس لیے اطمینان کے لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس پر گجراتی کے کسی فاضل سے ایک بار بہ احتیاط نظرثانی کرالی جائے۔ میری درخواست پر جناب اے۔ جی شیخ صاحب (گلبرک لاہور) نے از راہ کرم جناب عبد الخالق فاروقی صاحب کو، جو گجراتی زبان پر پوری قدرت رکھتے ہیں، یہ زحمت اٹھانے پر آمادہ کر لیا۔ میرے دوست گوہر نوشاہی صاحب فاروقی صاحب کی خدمت میں کئی روز جاتے رہے اور فاروقی صاحب اپنی گوناگوں اور کثیر مصروفیات کے باوجود ڈرامے کی تصحیح کے لیے برابر فرصت نکالتے رہے۔ اُن کی اس نوازش کے لیے میں ذاتی طور پر اور میرے ساتھ مجلس ترقی ادب اُن کی شکر گزار ہے۔

اب اس سلسلے کی چھ جلدیں قارئین کرام کی خدمت میں پیش ہیں۔ اردو ڈراموں کا یہ انتخاب، جو صرف اُن ڈراموں پر مشتمل ہے جو تھیٹریکل کمپنیوں کے اسٹیج پر آ کر مقبول و معروف ہوئے، انشا اللہ کُل تیس جلدوں میں ختم ہونے کی امید ہے۔ ان میں سے پہلی چودہ پندرہ جلدوں میں متقدمین اور متوسطین اور باقی جلدوں میں متاخرین کے ڈراموں کا انتخاب ہوگا۔ اگلی کئی جلدیں بھی مرتب ہو چکی ہیں اور اُن میں سے چند اب زیر طبع ہیں۔ ایک دو ڈرامے حاصل نہ ہو سکنے کے باعث بعض جلدیں مطبع کے حوالے نہ کی جاسکیں۔ اس سلسلے میں اگر کوئی صاحب اپنے ڈراموں کے ذخیرے سے ضرورت کے چند ڈرامے مستعار عنایت فرمائیں گے تو مجلس اُن کی احسان مند ہوگی۔

جو جلدیں پیش کی جا رہی ہیں، ممکن ہے اُن میں بعض عیب باقی رہ گئے ہوں۔ مجھ سے جو کچھ بھی ممکن تھا، میں

نے پوری محنت اور دلی خلوص سے کام لے کر اس میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ، لیکن میں چاہتا ہوں کہ اِس کام کو اردو ادب اور تھیٹر کی خدمت کا آغاز سمجھا جائے ۔ مجھے امید ہے کہ اس سلسلے کے مکمل ہوچکنے کے بعد مجھ سے زیادہ واقف کار حضرات اپنی وسیع تر معلومات اور قابل قدر مشوروں سے اسے مفید تر بنانے کی کوشش فرمائیں گے ۔

سید امتیاز علی تاج

بمبئی کا اردو ڈراما

انیسویں صدی کے نصف آخر میں پاک ہند برعظیم کے تین بڑے شہر ایسے تھے جہاں مغربی اثر کے تحت ڈراما اور اسے پیش کرنے کا ایک نیا شعور اور تصوّر پیدا ہوا اور کلب اور تھیٹریکل کمپنیاں اپنے اپنے مقاصد سے بقدرِ توفیق و استطاعت اسے صورت دینے کے کام میں لگ گئیں۔ یہ تین شہر تھے کلکتہ، بمبئی اور مدراس۔ برعظیم کے دوسرے بہت سے مقامات کی طرح ان تین شہروں میں بھی ڈراما اور اسے پیش کرنے کا طریقہ ایک ادنیٰ صورت میں پرانے زمانے سے چلا آ رہا تھا۔ اس کا قدیم سنسکرت ڈرامے سے تھوڑا بہت تعلق ضرور تھا، مثلاً ہاتھوں اور دوسرے اعضا کے ذریعے الفاظ کے معنی مناسب نرت یا حرکات کے ذریعے اسٹیج پر ادا کرنے کی روایت قدیم سنسکرت ڈرامے ہی سے آئی تھی مگر اس زمانے کے مروّجہ ڈرامے میں نہ قدیم سسکرت ڈراما کے فنّی رموز و محاسن تھے، نہ اس کی نفاست و لطافت، البتہ اس میں عہد وسطیٰ کی روایت کے بعض ایسے جاندار عناصر[1] نمایاں طور پر موجود تھے جو عوام کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، اس قسم کے ڈرامے پیش کرنے والی ٹولیاں قصبوں اور شہروں میں گھوم پھر کر تماشے دکھاتیں، امرا[2]

---

1. The Indian theatre by R.K. Yajnik page 67. 68.
2. India and its native Princes by louis Reusselet 1883 Page 25.

وہاں اور بہت سے لوگ موجود تھے ۔ ایک دیوان خانے کو تماشا گاہ بنا لیا گیا تھا ، اُس کا ایک سِرا جو سٹیج کا کام دے رہا تھا ، اُدھر ایک چھوٹے ہوئے باریک کپڑے کا پردہ بانس پر لٹکا ہوا تھا ۔ ہم ابھی بیٹھے ہی تھے کہ ایک برہمن چند بانسری نواز ساتھیوں کے ہمراہ پردے کے پیچھے سے سٹیج پر نمودار ہوا ۔ اُس نے علم و دانش کے دیوتا "گنیش" کی مورتی لا کر اسٹیج کے اگلے حصے میں رکھ دی ۔ برہمن نے دیوتا کی اُستتی کے بعد اُس سے پرارتھنا کی کہ ایکٹروں کو سُوجھ کی جوت دکھائے کہ وہ اپنے اپنے پارٹ صحیح طور سے ادا کر سکیں ۔ یہ تمہید تماشائیوں نے بڑے سکون کے ساتھ سنی ۔ میں دیکھ رہا تھا کہ تقریب کا یہ حصہ بھی کچھ کم سنجیدہ نہیں ہے ۔ اِس کے بعد برہمن نے اعلان کیا کہ ڈراما کرشن کی عشقیہ زندگی سے تعلق رکھتا ہے اور یہ اعلان کرنے کے بعد وہ اندر چلا گیا ۔

"پردہ فوراً اُٹھا تو سٹیج پر ایک بڑی شخصیت موجود تھی ۔ یہ شخص قریباً برہنہ تھا ، بھبوت رما رکھی تھی ، جٹائیں بہت لمبی تھیں ۔ پس منظر میں کپڑے پر مندر بنا ہوا تھا ۔ یہ شخص مندر کے دروازے پر مراقبے کے عالم میں بیٹھا تھا ۔ یہ ایک رِشی (مذہبی درویش) تھا جو ہندو ڈرامے میں عموماً مافوق الفطرت طاقت رکھتا اور ایک روحانی جِن کی طرح محافظت کی خدمت بجا لاتا ہے ۔

"اِس منظر میں دیویوں اور دیوتاؤں کی یلغار دکھائی گئی تھی ۔ میں نے اُن میں سے لیلے وِشنُو ، خوبصورت

سرسوتی ، رام اور بعض دوسری شخصیتوں کو بڑی آسانی سے شناخت کر لیا ۔ رشی کے سامنے جھک کر اُن میں سے ہر ایک نے ایک لمبی تقریر کی جو میں بہت کم سمجھ سکا ۔ جس چیز کو میں دل ہی دل میں ۔راہ رہا تھا ، وہ اُن کے لباس تھے ۔ وہ پرانی مورتیوں کے لباس سے اس قدر مطابقت رکھتے تھے کہ میری رائے میں یہ لوگ اُن کا روایتی تصور بہت صحت کے ساتھ پیش کر رہے تھے ۔ سب سے بڑھ کر دیوتا "گنیش" تھا جس کا ہاتھی کا سر ، بڑی سی توند اور چھوٹی چھوٹی ٹانگیں بڑے کمال کی تھیں ۔ سب دیوتاؤں نے اونچے اونچے سنہری مکٹ اور زرق برق لباس پہن رکھے تھے ۔ دیویوں کی پوشاک بے حد باریک اور شفاف کپڑے کی تھی جس پر موتی اور زر کا کام تھا ۔ تھوڑی ہی دیر بعد کرشن داخل ہوا تو دیوتاؤں کی یہ ٹولی غائب ہو گئی ۔ کرشن ایک سجیلا نوجوان تھا ، سارے جسم پر نیلا رنگ مل رکھا تھا ، لباس شاہانہ تھا ، اداس اور خیال میں غرق اِدھر اُدھر گھومنے اور اُن جذبات کو ناز سے بیان کرنے لگا جو اُسے بے چین کر رہے تھے ۔ محبتوں نے ، جو ایک ہی سی قوی نہیں ، اُسے غ ۔ے میں ڈال رکھا تھا ۔ اُس کی بیوی "ستیا بھاما" داخل ہو کر اُس کے قدموں پر گر پڑی ۔ اُس کی خوبصورت کالی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا رہی تھیں ۔ وہ دیوتا کے گھٹنوں سے چمٹ گئی ۔ ہندوؤں کی رسیلی اور ملائم زبان میں وہ دیوتا سے اُس کی بے اعتنائی کا شکوہ ۔ ے لگی ۔ پھر جب دیکھا کہ متاثر ہونے کے باوجود وہ

دبدھا میں پڑا ہے تو اٹھ کر اس سے لپٹ گئی اور محبت کی اداؤں سے اسے بے خود بنانے کی کوشش کرنے لگی۔ جہاں تک ایکٹروں کے کام کا تعلق تھا، یہ منظر فی الواقع دلآویز تھا۔ غم، محبت اور خوشی کے جذبات، فطری حسن اور ایسی نزاکت کے ساتھ ادا کیے گئے جس کی مجھے ایک ہندوستانی ایکٹرس سے توقع نہ تھی۔ ملبوسات کی زیبائش، زبان کی موسیقی اور ندرت اظہار اس کمال کی تھی کہ زبان سے نا واقفیت کے باوجود مجال نہ تھی کہ توجہ ایک پل کے لیے ادھر ادھر ہو۔

"یہ ایکٹر اسٹیج پر سے چلے گئے تو ایک نئی شخصیت "رکمنی" سٹیج پر آئی۔ یہ ستیا بھاما کی رقیب تھی۔ اس عورت میں شاہانہ وقار تھا۔ اس نے بڑے جوش سے بیان کیا کہ بے وفا کرشن کو اپنانے کے لیے وہ ناز و ادا کی کیسی جادو گری سے کام لے چکی ہے۔ اس کے بعد کرشن اپنی بیوی کے ساتھ پھر اسٹیج پر آیا، اب دونوں عورتوں کے درمیان شاعرانہ مکالمہ شروع ہوا۔ ایک کو اپنے حسب نسب پر جس کا سلسلہ وشنو تک جا پہنچتا تھا اور اپنے حسن و جمال پر ناز تھا، وہ کرشن کو اس کی بے وفائی پر ملامت کر رہی تھی۔ دوسری نے بڑے رسیلے لہجے میں کہا کہ میری خطا اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مجھے اپنے نرالے شوہر سے محبت ہے۔ اس نے بیان کیا کہ جب میں ایک کمسن دیہاتن تھی تو جمنا کے سحر آلود کناروں پر اپنی سہیلیوں کے جمگھٹے میں کھیلتے ہوئے میں نے دیوتا کی توجہ کیونکر حاصل کر لی تھی۔ میری زندگی بڑی سادہ رہی ہے اور

میں نے وفا کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا لیکن
جیت 'رکمنی' کی ہوتی ہے ۔ اُس کی گھمنڈی باتیں دیوتا
کے غرور کو بیدار کر دیتی ہیں ۔ ستیا بھاما باہر جاتی
اور اپنے بچّے کے ساتھ واپس آکر اُسے جُھک کر دیوتا
کے قدموں میں پیش کرتی اور کہتی ہے کہ "ہم دونوں
کو مار ڈالو ، کیونکہ ہم تمھاری محبت کے بغیر نہیں
جی سکتے ۔" رکمنی ان باتوں کا مذاق اُڑاتی ہے اور
اُس کے اُکسانے پر دیوتا (محبت کی آزمائش کے لیے) زہر
کا ایک پیالہ اپنی بیوی کو دیتا ہے ، وہ اسے ایک ہی
سانس میں پی کر زمین پر گر پڑتی ہے اور کہتی ہے 'میرا کام
زہر تمام نہیں کر رہا ، میری جان اُس شخص کی سردمہری
لے رہی ہے جسے میں دل و جان سے چاہتی ہوں ۔'
وہ اسے یقین دلاتی ہے کہ میں نے تمھیں معاف کیا اور
مر جاتی ہے ۔

"لیکن کوئی ہندو ڈراما ایسے غمناک طریق سے ختم نہیں
ہو سکتا ۔ "محافظ دیوتا" داخل ہوتا اور گرجدار آواز
میں کرشن کے عمل کا محاسبہ کرتا ہے ۔ پشیمانی کی
شدّت کے باعث کرشن سے کوئی جواب بن نہیں پڑتا، وہ
"رکمنی" کو نکال دیتا ہے اور دیوتا سے معافی کا خواستگار
ہوتا ہے ۔ "ستیا بھاما" زندہ ہو جاتی ہے اور اپنا بچہ
شوہر کی خدمت میں پیش کرتی ہے جسے وہ اپنے بازوؤں
میں لے لیتا ہے ۔ بنگالی روشنیوں کی جگمگاہٹ اور
تماشائیوں کی واہ واہ کے درمیان پردہ گرتا ہے ۔ اس ڈرامے
کے زیادہ حصے میں طویل تقریریں تھیں جنھیں ایکٹر
عوام کی طرف رُخ کر کے بولتے تھے ۔ اگر صرف عمل

پیش کیا جاتا تو کھیل بے حد مختصر ہوتا ۔ مناسب
اُتار چڑھاؤ کی جو نظمیں ایکٹروں نے ہلکی اور خوش آیند
آواز میں ادا کیں، ان سے برمحل حرکات کی سنگت کے باعث
طبیعت اُکتاتی نہ تھی ۔ تمام جذبات پر جیسے ایک سحرآلود
شیرینی کی مہر ثبت تھی ۔

"میں نے اپنے دوست گووند سے ایکٹروں کی استعداد کی
تعریف کی اور حسین ایکٹرسوں کے کام کو خصوصیت
سے سراہا ۔ ایکٹرسوں کی تعریف پر وہ کھلکھلا کر
ہنس پڑا ۔ کافی دیر تک ہنسنے کے بعد اُس نے مجھے بتایا
کہ ہمارے تھیٹر کے قوانین عورتوں کو سٹیج پر لانے کی
اجازت[1] نہیں دیتے چنانچہ عورتوں کے تمام کردار ایسے
نوعمر لڑکے ادا کرتے ہیں جو اپنے حسن اور خوش الحانی
کے اعتبار سے لا جواب ہوتے ہیں ۔ یہ معلوم کر کے میں
اتنا حیران ہوا کہ زندگی بھر نہ ہوا ہوں گا ۔ وہ بار بار
یقین دلا رہا تھا کہ میں نے اسٹیج پر جن عورتوں کو
دیکھا ، وہ سب لڑکے تھے مگر مجھے کسی طرح یقین نہ
آتا تھا ۔ کھیل کے بعد پانڈوؤں کی جنگ کا ایک واقعہ
پیش کیا گیا جس میں دیوتا اپنی لکڑی کی تلواروں سے
ہولناک وار کرتے رہے ۔"

مغربی سیاح کو یہ کھیل خلاف توقع جیسا بھی معلوم
ہوا ، اُس کے بیان سے اتنا بخوبی واضح ہے کہ اِس کھیل میں

---

۱ ۔ قدیم ہندو ڈرامے میں عورتوں کا کردار عورتیں ہی ادا کرتی
تھیں ۔ لیکن بعد میں یہ روایت ختم کر دی گئی ۔ (از انڈین
تھیٹر ، مصنفہ یجنیک ، صفحہ ۵)

بمقابلہ کسی فنی دلچسپی یا گرفت کے اصل چیز صرف دیوی دیوتاؤں سے تماشائیوں کی عقیدت تھی اورا سے قدیم سنسکرت ڈرامے کی مسخ شدہ زوایت کے انداز میں پیش کیا گیا تھا - یہ خصوصیات ایک مغربی سیاح کے لیے ایسی ہی نئی تھیں جیسے مغرب کا جدید ڈراما یہاں کے تماشائیوں کے لیے تھا -

ذکر تھا کلکتے ، بمبئی اور مدراس میں جدید تھیٹر پیدا ہونے کا - ان تینوں شہروں کو چند ایسی غیر معمولی خصوصیات حاصل تھیں جن کی بنا پر جدید تھیٹر بمقابلہ دوسرے شہروں کے یہاں پہلے پیدا ہوسکا - ایک تو یہ کہ ابتدا میں تجارت اور بعد میں تعلیم اور سیر و سیاحت کے سلسلے میں یہاں کے باشندوں کا مغربی ممالک سے تعلق مقابلتہً زیادہ رہا جہاں انھیں مغربی تھیٹر دیکھنے کے مواقع میسر آ سکے - پھر بتدریج انھی تینوں شہروں میں تعلیمی کالج قائم ہوئے جن کی اعلیٰ جماعتوں میں ہندوستانی طلبہ انگریزی ڈرامے کا مطالعہ کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ مطالعے کے ساتھ ڈراما سٹیج پر پیش کرنے کا خیال نہ آنا نا ممکن تھا - علاوہ ازیں انھی تینوں شہروں میں یوروپین شہری اور فوجی مقابلتہً زیادہ تعداد میں مقیم رہتے تھے جو ایک طرف شوقیہ کام کرنے والی مقامی یوروپین کلبوں کی حوصلہ افزائی کرتے اور دوسری طرف اپنی تفریح کے لیے یورپ کی پیشہ ور کمپنیوں کو وقتاً فوقتاً مدعو کرتے رہتے تھے - اس سلسلے میں سر ڈی بی واچا لکھتے ہیں[1] :

"اپنے سنہری دنوں میں یعنی ۱۸۶۳ع سے ۱۸۸۰ع تک گرانٹ روڈ تھیٹر ہال میں کئی غیر ملکی ڈراما

---

1 Shells from the sand of Bombay by Sir D. B Wacha. 1920. Page 350, 352 353.

کمپنیاں مدعو کی گئیں ۔ ان میں اپنے زمانے کی نامور "اطالوی اوپیرا کمپنی" بھی شامل تھی ۔ یہ وہ دورِ عافیت تھا جب بمبئی کا ہر شخص روپے میں کھیلتا تھا ۔ اطالوی اوپیرا کمپنی کو ڈراما اور موسیقی کا ذوق رکھنے والے یورپی باشندوں کی ایک مجلس نے مدعو کیا تھا ۔ اس مجلس کے ایک رکن کا نام سنکلیر تھا جو الفنسٹن کالج کا پروفیسر تھا ۔ لیکن یہ کمپنی سر جارج برڈ وڈ جیسے نکتہ کار لوگوں کے ذوق پر پوری نہ اتر سکی ۔ ان کے خیال کے مطابق کمپنی کی رقاصائیں خوبصورت مگر فربہ اندام اور ادھیڑ عمر کی تھیں ۔

"لیکن وہ مزاحیہ اداکار ڈیو کارسن تھا جس نے صحیح معنوں میں گرانٹ روڈ تھیئٹر کو بمبئی کے ڈراما کے شائقین میں شہرت بخشی اور کئی سال تک ہزاروں لوگوں کے ذوق کی تشفی کرکے خود کو اور اپنی کمپنی کو مالی فائدہ پہنچاتا رہا ۔ ڈیو کارسن بڑا زندہ دل اور لطیفہ گو اداکار تھا ۔ وہ تماشائیوں کا نبض شناس تھا اور برجستہ مزاح میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا ، وہ مقامی موضوعات اور موضوعاتی گیتوں سے حاضرین کو مسحور کر لیتا ، مختلف کرداروں کو بڑی کامیابی سے پیش کرتا ، لیکن اس کا مقبول ترین کردار پارسی چھیلے کا تھا جس میں وہ "میڈم رتی" سے عشق کا اظہار کرتا تھا ۔ اس کے مزاح اور گیتوں پر سارا ہال قہقہوں سے گونج اٹھتا ۔ وہ ذہین اداکار تھا اور گرانٹ روڈ تھیئٹر کے سٹیج پر بہت سے کردار ادا کر چکا تھا ۔ جن لوگوں نے اُسے دیکھا ہے وہ آج بھی اس کی یاد سے محظوظ ہوتے ہیں ۔ لیکن

بنگالی بابو کے پارٹ اور اسی نام کے گیت کی بدولت ڈیوکارسن کا نام عرصۂ دراز تک زندہ رہے گا ۔ آج بھی بمبئی کے مشہور "نان خطائی" نامی باجے والے بیاہ شادیوں اور سالِ نو کی تقریبات پر اُس گیت کی دُھن بجاتے سنے جاتے ہیں ۔ مجھے پورا گیت تو یاد نہیں البتہ اُس کے چند ابتدائی مصرعے یاد ہیں (غلط بابو انگریزی کا غلط اردو نثر میں ترجمہ) :

"ہم کہاں کا بنگالی بابو
"کلکتے کا پرانا باشی
"رام چند ٹُنڈا گوش اپنا نام
"رادھا بازار میں ہمارا دکان
"حقہ پیتا ہمرا اچھا اچھا ہندو
"اور دال بھات کھاتا روز روز ہمرا
"رات پڑتا تو ہم بڑی بوجا پاٹ کرتا
"ناچ والا ڈھول پیٹتا آیا
"کچھ پروا نہیں ، اچھا وقت بھی آتا
"بابومت گھبراؤ ، بابو مت گھبراؤ

"بعد میں یعنی آٹھویں عشرے کے دوران جو ڈراما کمپنی سب سے زیادہ مقبول ہوئی اور جو واقعی اچھے ادا کاروں پر مشتمل تھی ، وہ میڈم کارلٹا تاسکا کی کمپنی تھی ۔ یہ کمپنی خاصی مستحکم تھی ، اس میں ایسامبے سب سے بہتر ایکٹرس تھی ۔ اداکاری کے فن میں اِس جیسی صلاحیت مجھے بعد میں کہیں نظر نہ آ سکی ۔ اِسی کمپنی میں فیٹر کاف نامی ایک ایکٹر بھی تھا جس کی ڈرامائی صلاحیت قابل تحسین تھی ۔ وہ

"ہیملٹ" "اوتھیلو"، "میکبتھ" کے اور بعض دوسرے پارٹ اتنی خوش اسلوبی اور جامعیت سے ادا کرتا کہ لندن کے تھیٹر یاد آ جاتے - ایساسے اوفیلیا ، ڈیزڈیمونا ، پوشیا اور دوسرے کردار ادا کرتی - میڈم کارلٹا کی کمپنی کے مقابلے میں کوئی دوسری کمپنی حتیٰ کہ چند برس بعد آنے والی "ہیر بینڈ" ین کی کمپنی بھی شیکسپیئر کے ڈراموں کو اتنی عمدگی سے پیش نہ کر سکی - فیئر کلف نے بعض ڈرامائی تحریریں ٹاؤن ہال میں بڑھ کر بھی سنائیں جنھیں بے حد سراہا گیا - اس نے شیکسپیئر کے ڈرامے "ہنری پنجم" کے بعض حصوں ، ٹینی سن کی نظم "چارج آف دی لائٹ بریگیڈ" اور ایڈگر ایلن پو کی نظم "ریون" کی خوش خوانی سے بمبئی کے باذوق حاضرین کی رگوں میں برق لہر سی دوڑا دی -"

پیشہ ور تھیٹریکل کمپنیوں اور کلبوں کے اس قسم کے تماشے دیکھ کر بمبئی ، کلکتہ اور مدراس کے ہندوستانی طالب علموں اور شوقین مزاج لوگوں میں بھی مغربی ڈراما اور اسے مغربی انداز میں پیش کرنے کا شوق پیدا ہوا اور آگے چل کر ان تینوں شہروں میں سے جس شہر نے اپنی کوششیں زیادہ‌تر اردو کے لیے وقف کر دیں ، وہ بمبئی تھا -

اردو ڈراما بمبئی میں کب شروع ہوا ؟ اس کے سنہ اور تاریخ کا تعین آسان نہیں - سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ بمبئی میں اردو کے علاوہ تین اور زبانیں بھی مستعمل تھیں : مرہٹی ، گجراتی اور ہندوستانی[1] - بعض تذکروں اور مغربی

---

۱ - ہندوستانی سے میری مراد سنسکرت آمیز زبان ہے جو اُس زمانے کے ہندو ادب میں استعمال کی جاتی تھی -

سیّاحوں کے سفرناموں میں چند پرانے اور نئے تماشوں[1] کی قابل قدر تفصیلیں ضرور مل جاتی ہیں لیکن یہ معلوم نہیں ہونے پاتا کہ یہ تماشے تھے کس زبان میں ۔ ان سیّاحوں کے لیے چونکہ یہاں کی ہر زبان اجنبی تھی ، اس لیے اوّل تو اُنھیں پتا نہ چلنے پاتا کہ جو تماشا وہ دیکھ رہے ہیں وہ کس زبان میں ہے ۔ علاوہ ازیں تماشے کی اسٹیجی خصوصیتوں کے مطالعے کا انہاک اُنھیں کسی اور طرف توجہ کرنے کی مہلت بھی نہ دیتا تھا ۔ اُدھر ان تماشوں میں سے اکثر کے موضوع کا تعلق ہندوؤں اور پارسیوں کے روایتی مشاہیر کی زندگی کے کسی واقعے سے تھا ، چنانچہ تماشے کا نام انھی مشاہیر کے نام پر رکھا جاتا تھا ، اس لیے ان تماشوں کے ناموں سے بھی یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ یہ اردو تماشے کا نام ہے یا کسی مرہٹی یا گجراتی یا ہندی تماشے کا ۔ اب تک جتنی تحقیق ہوئی ، اُس سے پتا چلتا ہے کہ یہ بہت مختصر ابتدائی ڈرامے شائع بھی نہیں ہوئے ، غالباً مسودوں ہی کی صورت میں رہ کر تلف ہو گئے یا ممکن ہے ابتدائی تھیئٹر سے کسی نوع کا تعلق رکھنے والے کسی خاندان کے کاغذات میں متاعِ عزیز کی صورت یا کس مپرسی کی حالت میں پڑے ہوں ۔ جو مطبوعہ ڈرامے اب تک دستیاب ہوئے ہیں اُن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وکٹوریا ناٹک منڈلی جو اردو تماشے دکھاتی تھی، خود اُسی کے ایما سے یہ ڈرامے سب سے پہلے گجراتی رسم الخط میں شائع ہونے شروع ہوئے ۔ اس رسم کے پڑنے کی دیر تھی کہ بمبئی اور ہندوستان کے کئی دوسرے شہروں سے وہاں کے مروّجہ رسم الخط میں اردو ڈرامے شائع ہونے لگے لیکن ان

---

۱ ۔ مثلاً سیتا سوئمبر ، راجہ گوپی چند ، رستم سہراب اور بیزن منیزہ وغیرہ ۔

مطبوعہ ڈراموں میں سے ۱۸۷۱ع سے پہلے کا کوئی اردو ڈراما دیکھنے کا اتفاق اب تک نہیں ہوا ۔

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی نے اپنی کتاب "اردو تھیٹر" میں اس خیال کا اظہار فرمایا ہے کہ بمبئی میں پرتگیزوں کی توجہ سے اردو زبان سولھویں صدی ہی میں اسٹیج پر پہنچ چکی تھی ۔ وہ تحریر فرماتے ہیں[1] :

"پرچگیز نے گوا فتح کرنے کے بعد جب حدودِ سلطنت کو وسعت دی اور مختلف مشنوں کے ذریعے تبلیغی سرگرمیاں شروع کیں تو اُن کو ایک ایسی زبان کی ضرورت پیش آئی جو شمالی اور جنوبی ہند میں یکساں کام آئے ۔ یہ زبان ہندوستانی یا اردو تھی جو اگرچہ اب تک سن شعورکو نہیں پہنچی تھی ، پھر بھی تبلیغی ضرورت کے لیے کافی تھی ۔ پرچگیز نے اس زبان کو حضرت عیسیٰ کی زندگی کے حالات اسٹیج پر پیش کرنے کا ذریعہ بنایا ۔"

لیکن ڈاکٹر نامی نے اپنے اس دعوے کی تصدیق میں کوئی ثبوت یا حوالہ نہیں دیا ۔ اُنھوں نے چند ایسے پرتگیز مصنفوں کے ناموں کی فہرست ضرور درج کی ہے جنھوں نے ہند کے حالات پر کتابیں لکھی ہیں لیکن اس فہرست کے ساتھ یہ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ کس مصنف کی کون سی کتاب سے انھیں یہ پتا چلا کہ "اردو کے ابتدائی ڈرامے جو پرچگیز اور اُن کے تبلیغی مشنوں نے دکھلائے ، وہ سب مذہبی ہیں اور حضرت عیسیٰ کی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو سے تعلق رکھتے ہیں ۔" چنانچہ اُن کے اِس دعوے کو دستاویزی ثبوت کے بغیر قابلِ اعتنا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے ۔

---

۱ ۔ اردو تھیٹر ، جلد اول ، مصنفہ ڈاکٹر نامی ، صفحہ ۴۵ ۔

پرتگیز عیسائیوں (بمبئی کے باشندے) کے ایک تصلیبی کھیل کی جو تفصیل درج ذیل ہے، وہ ۱۸۲۲ع کے گڈ فرائڈے کے روز پیش کیا گیا تھا[1] - اگر اس دوران میں اپنے تصلیبی کھیل پیش کرنے میں پرتگیزوں میں اردو استعمال کرنے کا رواج ہو چکا ہوتا تو گائیڈ میں اس کا تذکرہ نظر انداز ہو جانا ممکن نہ تھا -

"بمبئی اپنے تصلیبی کھیلوں کے لیے شہرت رکھتا ہے - بندوڑا میں[2] مقامی رومن کیتھولک عیسائیوں کی خاصی بڑی آبادی ہے - اس جگہ ایک گرجا میں لمبی سی میز رکھی گئی تھی جس پر تیرہ آدمیوں کے سامنے پھلوں سے بھرے ہوئے طشت رکھے تھے - یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آخری طعام کا نقشہ تھا - جو لوگ میز پر بیٹھے تھے، ان میں سے ایک نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا روپ بھر رکھا تھا اور ایک جس کے ہاتھ میں تھیلا تھا یہودا بنا ہوا تھا - اگلے روز حضرت عیسیٰ کو مصلوب کیا جانا تھا -

اگلے روز حضرت عیسیٰ[4] کا مجسمہ، جو موم سے تیار کیا گیا تھا، سرخ روغن مَل کر (گویا) خون آلود بنا دیا گیا تھا - سینٹ انڈریو کے گرجا کے صحن میں جمعے کے روز بعد از دوپہر غیر معمولی ہنگامہ تھا، ایک ہزار عورتیں سر سے پاؤں تک سفید لباس میں ملبوس بیٹھی تھیں، تمام صحن لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا -

---

۱ - از 'اے گائیڈ ٹو بمبے' مرتبہ جے ایم میکلین مطبوعہ بمبے گزٹ آفس -
۲ - تصلیبی کھیل کی تفصیل ۲ اپریل ۱۸۷۲ع کے بمبے گزٹ سے لی گئی ہے -

ایک کونے میں روسٹرم کے پیچھے ایک پادری کھڑا
اونچی آواز میں تقریر کر رہا تھا ۔ اس کے بعد شام کے
سائے پھیلنے لگے اور منظر دھندلا پڑ گیا ۔ صحن کے
دروازے اور دیواروں پر بے شمار پارسی اور ہندو تماشائیوں
کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے ، اس سے ظاہر تھا کہ یہ
لوگ ایک دوسرے کی مذہبی تقریبات کی حرمت کرتے
تھے ، کیونکہ یہ لوگ جب تک کھڑے رہے ، بالکل
خاموش رہے ۔ آٹھ بجے کے قریب حضرت عیسٰی کا چہرہ
بے نقاب کیا گیا ۔ اس پر حاضرین میں جوش و خروش
کی ایک لہر دوڑ گئی اور لوگوں کے جذبات ، ان کی
چیخ پکار اور سیلِ گریہ و زاری میں بہتے ہوئے نظر آنے
لگے۔ لوگ مصنوعی خون کے دھبّوں اور موم کی کیلوں
کو حقیقی سمجھتے اور دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔
حضرت عیسٰی کے جسم کو سولی سے اتارنے اور ان کے
چہرے کی نقاب کُشائی میں ایک خاص ڈرامائی عمل سے
کام لیا گیا تھا ۔"

رسم کے اس سارے عمل میں اردو کے استعمال کا اگر
کوئی موقع تھا تو پادری کی تقریر میں ۔ صرف ایک آدمی کا
اردو استعمال میں لانا نہ دشوار تھا ، نہ تبلیغی نقطۂ نظر سے
غیر مؤثر سمجھا جا سکتا تھا ۔ لیکن اگر ۱۸۷۲ع میں اردو سے
کام نہیں لیا گیا تو ڈاکٹر نامی کے اس قیاس کو صحیح سمجھنے کی
وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ پرتگیزوں نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں
کے لیے سولھویں صدی میں اردو کو اپنا لیا تھا ۔

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کے بیان کے مطابق برطانوی عہد
میں اردو کا پہلا ڈراما "راجہ گوپی چند اور جلندھر" ہے جسے

ہندو ڈریمیٹک کور کے مرہٹہ ایکٹروں نے مرہٹی زبان کے چند کھیل دکھانے کے بعد ۱۸۵۳ع میں سٹیج پر پیش کیا تھا۔ اسے اردو میں لکھنے کی صورت بقول ڈاکٹر نامی کے یوں پیدا ہوئی[1] :

"جگن ناتھ سیٹھ بمبئی کے ایک متموّل و نامور تاجر خاندان میں سے تھے۔ انھوں نے انگریز استادوں سے انگریزی تاریخ و فلسفہ اور ہندو پنڈتوں سے سنسکرت اور مرہٹی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد رفاہ عام کے کئی کام کیے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے جدا جدا مدارس بنائے، شہر بمبئی میں الفنسٹن کالج، گرانٹ میڈیکل کالج اور لاء کالج قائم کیا۔ ایسی غیر معمولی معاشرتی خدمات سر انجام دینے پر حکومت کی طرف سے اعلیٰ خطابات پائے۔ لوگوں نے مرہٹہ لباس میں ان کا سنگ مرمر کا مجسّمہ بمبئی کے ٹاؤن ہال کی شمال مشرق ڈیوڑھی میں نصب کیا۔ یہ صاحب اتفاق سے تھیٹر کے رسیا بھی واقع ہوئے تھے۔ اس زمانے میں سارے بمبئی میں صرف ایک ہی تھیٹر ہال تھا جو بمبئی تھیٹر کہلاتا تھا۔ اسے یورپینوں نے تعمیر کیا تھا، وہی اس پر قابض اور اس کے کرتا دھرتا تھے۔ عام ہندوؤں کو اس تھیٹر کے تماشوں میں آنے جانے کی اجازت نہ تھی، لیکن جگن ناتھ سیٹھ جیسے معزز ہندی بعض خاص تقریبوں پر مدعو کر لیے جاتے تھے۔ یہاں یورپینوں کے تماشے دیکھ کر جگن ناتھ سیٹھ کا دل

۱۔ ڈاکٹر نامی کے مضمون مطبوعہ نوائے ادب بمبئی بابت جنوری ۱۹۶۰ع سے معلومات اخذ کی گئیں۔

مچل مچل جاتا کہ کاش ہندی بھی ایسے ہی کھیل اپنی
زبان میں پیش کر سکتے۔ جگن ناتھ سیٹھ نے ۱۸۴۵ع میں
"نیو تھیئٹر بمبئی" کے نام سے ایک نیا منڈوہ تعمیر کیا۔
ابتدا میں اس نئے منڈوے میں بھی انگریزی کھیل
دکھائے گئے لیکن جگن ناتھ سیٹھ چونکہ اس منڈوے
کی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے، اس لیے ان کی کوششوں
کی بدولت صوبائی زبان میں بھی تماشے دکھائے جانے کی
اجازت مل گئی۔ ہندی ایکٹروں کی ایک جماعت "ہندو
ڈرامیٹک کور" کے نام سے قائم ہوئی اور اس کی طرف سے
مرہٹی تماشے "نیو بمبئی تھیئٹر" کے اسٹیج پر پیش کیے جانے
لگے۔ ۹ مارچ ۱۸۵۳ع سے ۱۷ دسمبر ۱۸۵۳ع تک مراٹھی
کے کل نو تماشے دکھائے گئے۔"

مرہٹی ڈرامے، توقع کے خلاف منفعت بخش ثابت نہیں
ہوئے[1]۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان ڈراموں کو
صرف مرہٹے ہی دیکھ سکتے تھے اور مرہٹہ تماش بینوں میں
بد قسمتی سے زیادہ تعداد مزدور پیشہ لوگوں کی تھی۔ مرہٹے
اداکار بھی کم تنخواہ پا کر بد دل ہو چکے تھے۔ اس لیے کافی
غور و خوض کے بعد طے کیا گیا کہ اب ہندوستانی یعنی اردو
زبان میں تماشے دکھلائے جائیں تاکہ تماشائیوں کی تعداد
میں اضافہ ہو اور ہر قوم بلا تفریقِ مذہب و ملت ناٹک سے
لطف اندوز ہو سکے۔ تھیئٹر والوں کی درخواست پر گورنر اِن
قونصل نے اس تھیئٹر کی سر پرستی قبول کر لی اور ضروری

۱۔ از مقالہ محترمہ میمونہ بیگم، زیر عنوان "بمبئی کے تھیئٹروں کے
اردو ڈرامے۔"

انتظامات کے بعد تھیٹر کا اہتمام ڈاکٹر بھاؤ واجی لاڈ کے سپرد کیا گیا[1] :

"بھاؤ واجی لاڈ کا اصلی نام رام کرشن تھا - یہ صاحب گوا کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے لیکن خاندان کے سارے لوگ نقلِ مکان کر کے جب بمبئی چلے آئے تو یہ بھی ان کے ساتھ یہیں آ کر آباد ہو گئے - لاڈ شطرنج کے بہت اعلیٰ کھلاڑی تھے - اپنے اس شوق کی بدولت ان کی رسائی بمبئی کے گورنر ارل آف کلیر (earl of clair) تک ہو گئی - ان کی امداد سے انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد الفنسٹن انسٹیٹیوٹ میں کیمسٹری اور فلاسفی کے پروفیسر مقرر کیے گئے - لاڈ کی سیٹھ جگن ناتھ سے گہری دوستی تھی - ان کی سرپرستی میں انھوں نے ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور بہت جلد ایک کامیاب سرجن کی حیثیت سے مشہور ہو گئے - ڈاکٹر لاڈ نے تاریخ اور علم و ادب کا بہت اچھا ذوق پایا تھا ، چنانچہ انھوں نے انگریزی کی کئی درسی کتابیں مراٹھی میں ترجمہ کرائیں - معاشری خدمت کے جذبے نے لڑکیوں کے ایک اسکول کے جملہ اخراجات خود برداشت کرنے پر آمادہ کر دیا - ڈاکٹر لاڈ کو تھیٹر سے بھی کچھ کم دلچسپی نہ تھی ، چنانچہ انھوں نے کالی داس الفنسٹن سوسائٹی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا - اپنے بعض ہم عصر مسلمانوں سے بھی ان کے مراسم گہرے تھے - عربی اور فارسی کی استعداد اچھی تھی -

---

۱ - ڈاکٹر نامی کا مضمون مطبوعہ 'نوائے ادب' بمبئی بابت ماہ جنوری ۱۹۶۱ع -

غالباً اسی وجہ سے مسلمانوں سے تعلقات قائم ہو گئے تھے۔"

"(ان)[1] ڈاکٹر بھاؤ واجی لاڈ نے ۱۸۵۳ء میں "راجہ گوپی چند اور جالندھر" کے نام سے ایک ڈراما (اردو میں) ہندو ڈرمیٹک کور کے لیے قلم بند کیا ۔ اس کور کے سب ایکٹر مرہٹے تھے لیکن زبان عام پسند ہونے کی وجہ سے ان ایکٹروں کو (اردو) ڈراما کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ ائی ۔ یہ ڈراما ۲۶ ۔ نومبر کو بمبئی تھیٹر (لبو بمبئی تھیٹر ۔ مرتب) میں اسٹیج کیا گیا ۔ عوام نے اسے بے حد پسند کیا اور ان کے اصرار پر ۳ دسمبر کو اس ڈرامے کا دوسرا حصہ بھی اسٹیج پر لایا گیا اور ۷ ۔ جنوری ۱۸۵۴ء کو دونوں حصے بہ یک وقت دکھلائے گئے۔ ۶ فروری ۱۸۵۵ء کو دونوں حصوں کو (پھر) اسٹیج کیا گیا ۔ ڈاکٹر لاڈ نے اس ڈرامے کی مقبولیت کے بعد "سیتا کی شادی" کے نام سے ایک ڈراما لکھا جو ۱۲ نومبر ۱۸۵۵ء کو بمبئی تھیٹر میں دکھایا گیا ۔"

"۱۸۵۵ء[2] کے بعد تقریباً دو سال تک بمبئی کے تھیٹروں میں جتنے اردو ڈرامے پیش کیے گئے اس کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ، اس لیے وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ ۱۸۵۵ء کے مذکورہ بالا ڈراموں کے بعد اگر اور اردو ڈرامے اسٹیج ہوئے تو وہ تعداد میں کتنے تھے ۔ مذکورہ بالا ڈراموں کے بعد اسٹیج ہونے والے جن ڈراموں کے متعلق

---

۱ ۔ از "اردو ڈراما" مقالہ محترمہ میمونہ بیگم صاحبہ جو بمبئی یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کے لیے پیش ہوا ۔

۲ ۔ از "اردو ڈراما" مقالہ محترمہ میمونہ بیگم ۔

معلومات دستیاب ہوتی ہیں ، ان کا تفصیلی ذکر ذیل میں درج کیا جاتا ہے :

"۱۸۵۵ع میں زور آسٹرین کلب نے "فرنگی اور ہندوستانی طرز ہائے حکومت کا موازنہ" پیش کیا جس کے خاتمے پر "بوڑھے خوشحال کی دعوت" نامی ایک مزاقیہ (کامک) بھی دکھلایا گیا ۔ یہ پورا ڈراما نثر میں تھا اور بہت کامیاب رہا ۔ اس ڈرامے کی کامیابی دیکھ کر ۱۸۵۹ع میں وکٹوریا کلب نے غدر ۱۸۵۷ع کے واقعات "نانا صاحب" کے نام سے اسٹیج کیے ۔ اس ڈرامے میں جنگ آزادی کے ایک ہیرو نانا صاحب کو غدارِ قوم اور وطن دشمن کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا ۔

"مذکورہ بالا دونوں ڈرامے در اصل انگریزی حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے پیش کیے گئے تھے ۔ حکومت جنگِ آزادی میں حصہ لینے والے مسلمانوں اور ہندوؤں سے باز پرس کر رہی تھی اور (انھیں) عبرت ناک سزائیں دے رہی تھی ۔ ان حالات کے پیش نظر دوسری قومیں بڑھ چڑھ کر اپنی رواداری کے اعلان کر رہی تھیں ، چنانچہ جب پارسیوں نے انگریزی حکومت کو آسمانی برکتوں کا سرچشمہ اور ہندوستانی حکم رانوں کو نا اہل اور نا لائق ثابت کرنے کی کوششیں کیں اور نانا صاحب کو چنڈال ، موذی اور بد سیر کے نام سے نوازا تو پارسیوں اور انگریزوں کے ساتھ ساتھ (مصلحت بیں) ہندو بھی بہت خوش ہوئے اور یہ دونوں ڈرامے عوام میں بہت مقبول ہوئے ۔

"اس بات کا پتا نہیں چلتا کہ یہ ڈرامے کس تھیٹر میں

اسٹیج ہوتے تھے۔ اس زمانے میں انگریزی ، مرہٹی ، گجراتی اور ایرانی کمپنیاں گرانٹ روڈ کے رائل تھیٹر (ناولٹی تھیٹر) میں تماشے دکھلاتی تھیں ۔ ممکن ہے کہ یہ ڈرامے بھی اسی تھیٹر میں دکھلائے گئے ہوں ۔

"ان ڈراموں کے بعد ۱۸۶۴ع میں الفریڈ ناٹک منڈلی نے "اندر سبھا" کے نام سے گجراتی ڈراما پیش کیا ۔ پھر اسی ڈرامے کو اردو میں پیش کیا ۔ اس کے بعد اسی کمپنی کے ڈرامے "گلرو زرینہ" کا نمبر آتا ہے جو ۱۸۶۷ع میں پہلے گجراتی اور پھر اردو میں اسٹیج کیا گیا ۔ مذکورہ بالا سطور میں جن ڈراموں کا ذکر کیا گیا ، ان سے اردو ڈرامے کی ابتدا ہوتی ہے ۔ یہ محض ابتدا ہی ہے ۔"

محترمہ میمونہ بیگم صاحبہ کے بیان کے مطابق اردو کے ابتدائی ڈرامے ۱۸۵۳ع سے ۱۸۶۷ع تک اس ترتیب سے اسٹیج پر آئے :

۱ - ہندو ڈریمیٹک کور کا "راجہ گوپی چند اور جلندھر" حصہ اول : ۲۶ نومبر ۱۸۵۳ع کے روز ۔

۲ - ہندو ڈریمیٹک کور کا "راجہ گوپی چند اور جلندھر" حصہ دوم : ۳ دسمبر ۱۸۵۳ع کے روز ۔

۳ - ہندو ڈریمیٹک کور کا "راجہ گوپی چند اور جلندھر" (مکمل) : ۷ جنوری ۱۸۵۴ع کے روز ۔

۴ - ہندو ڈریمیٹک کور کا "راجہ گوپی چند اور جلندھر" (مکمل): ۹ فروری ۱۸۵۵ع کے روز دوبارہ ۔

۵ - ہندو ڈریمیٹک کور کا "سیتا کی شادی" : ۱۲ نومبر ۱۸۵۵ع کے روز ۔

---

۱ - بمبئی کے تھیٹر ہالوں پر ملاحظہ فرمائیے کتاب کے آخر میں ضمیمہ نمبر ۲ ۔

اس کے بعد دو سال کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے ۔ اس کے بعد :

٦ ۔ زور آسٹرین کلب کا ''فرنگی اور ہندوستانی طرز ہائے حکومت کا موازنہ'' اس کے خاتمے پر ''بوڑھے خوشحال کی دعوت'' : (ایک نقل) ۱۸۵۸ع میں ۔

۷ ۔ وکٹوریا کلب کا ''نانا صاحب'' : ۱۸۵۹ع میں ۔

۸ ۔ الفریڈ ناٹک منڈلی کا کھیل ''اندر سبھا'' : ۱۸٦۴ع میں ۔

۹ ۔ الفریڈ ناٹک منڈلی کا کھیل ''گلرو زرینہ'' : ۱۸٦۷ع میں ۔

اردو ڈراموں کے اسٹیج پر آنے کی یہ ترتیب محترمہ میمونہ بیگم نے کس کتاب ، رسالے یا اخبار کی امداد سے یا اردو ڈرامے کے کس مستند کارکن کے خطوط ، روزنامچوں یا بیان سے مرتب کی ؟ مقالے سے اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا ۔ انھوں نے جس ڈرامے کو اردو کا پہلا ڈراما قرار دیا ہے ، اس کے موضوع ، مرہٹی ایکٹروں کی استعداد اور اس زمانے کے بمبئی کے تماشائیوں کی بولی کا خیال کرتے ہوئے کسی قطعی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے مستند شہادتوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ۔ اسی طرح کھیل ''سیتا کی شادی'' بھی بظاہر ایک ایسا موضوع ہے جس کے لیے اردو شاید غیر موزوں زبان سمجھ کر استعمال میں نہ لائی گئی ہو ۔ زور آسٹرین کلب کے کھیل کا نام ''فرنگی اور دیسی طرز ہائے حکومت کا موازنہ'' بتایا گیا ہے ، لیکن یہ ایک ایسا طویل اور عوام کے لیے ادق نام ہے کہ خیال ہوتا ہے یہ نام کھیل کا اصلی نام نہیں بلکہ شاید انگریزی یا مرہٹی زبان سے ترجمہ کیا گیا ہے ، لیکن اس نام کے انوکھے پن کے متعلق حاشیے میں ایک لفظ بھی لکھنے

کی ضرورت نہیں سمجھی گئی ۔ اسی طرح "نانا صاحب" کے متعلق "چنڈال ، موذی اور بد سیر" کے الفاظ نہ جانے اصل ڈرامے کے الفاظ ہیں یا مرہٹی یا گجراتی کے الفاظ کا ترجمہ ؟ اگر ان الفاظ کا تعلق اردو ڈرامے سے ہے تو ڈرامے کی زبان کے متعلق اور معلومات کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے ۔ علاوہ ازیں بمبئی کے ایک مقالہ نویس سے اس اطلاع کی توقع بھی تھی کہ یہ دونوں ڈرامے شائع ہوئے یا نہیں ۔ اگلے دو کھیل الفریڈ ناٹک منڈلی کے بتائے گئے ہیں لیکن چونکہ اس نام کی دو تھیئٹریکل کمپنیاں شہرت پا چکی ہیں اس لیے اس کے متعلق بھی حاشیے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ۔ اسی طرح ایک حاشیے کی ضرورت "گلرو زرینہ" پر بھی ہے ۔ چونکہ اس نام کے ڈرامے میں عباس علی ایکٹر نے بعد میں پارٹ کرکے شہرت حاصل کی ، اس لیے یہ اگر اس ڈرامے کی کوئی ابتدائی صورت تھی تو اسے کس نے تصنیف کیا تھا ؟

دوسری طرف ڈاکٹر نامی ابتدائی اردو ڈراموں کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :

"جگن ناتھ شنکر[1] سیٹھ چونکہ ادبی ذوق کے انسان تھے اس لیے ان کی خواہش ہوئی کہ بمبئی تھیئٹر میں مرہٹی ڈرامے[2] بھی اسٹیج کیے جائیں ، چنانچہ ۹ مارچ سے

---

۱ ۔ بتایا جا چکا ہے کہ اس تھیئٹر ہال میں ، جس کے مالک جگناتھ شنکر سیٹھ بن گئے تھے ، پہلے صرف انگریزی ڈرامے دکھائے جاتے رہے تھے ۔ اردو تھیئٹر ، جلد اول ، صفحہ ۱۵۲ ۔

۲ ۔ غالباً ڈاکٹر نامی کی مراد ہے "مرہٹی ڈراموں کے ساتھ ساتھ" کیونکہ بقول ان کے ہندو ڈرمیٹک کور اردو کا پہلا ڈراما ۱۸۵۳ع میں پیش کر چکی تھی اور یہی ڈرمیٹک کور ۱۸۵۵ع

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

۱۷ دسمبر ۱۸۵۳ع تک (کُل) نو مرہٹی تماشے دکھلائے گئے ، لیکن سوائے نقصان کے کچھ ہاتھ نہ آیا ۔ جگن ناتھ شنکر نے بعد مشورہ بالآخر یہ طے کیا کہ مرہٹی کی بجائے اردو ڈرامے اسٹیج کیے جائیں تا کہ نقصان کا بار کم ہو اور ہندو ڈریمیٹک کور کچھ عرصہ اور زندہ رہ سکے۔ چنانچہ کور نے بروز ۲ نومبر اور ۳ نومبر ۱۸۵۳ع "راجہ گوپی چند اور جلندھر" نامی ڈراما ہندوستانی زبان میں دکھایا ۔ اس کے بعد ۱۸۵۴ع میں ۷ جنوری کو اور ۱۸۵۵ع میں ٦ فروری ، ۳ نومبر اور ۱۲ نومبر کو ہندوستانی تماشے دکھلائے ۔

۱۸۵۳ع ، ۱۸۵۴ع اور ۱۸۵۵ع میں (نیو) بمبئی تھیٹر میں جو اردو ڈرامے دکھلائے گئے، ان کے نام بقول ڈاکٹر نامی یہ ہیں[1] :

۱ ۔ راجہ گوپی چند اور جلندھر ، مصنفہ ڈاکٹر بھاؤ واجی لاڈ : ۲ ۔ نومبر ۱۸۵۳ع

۲ ۔ تیکھے خان ۔

۳ ۔ حاجی میاں اور ملازم تیکھے خان[2] ۔

۴ ۔ حاجی میاں اور فضل مع نقل کلال خانہ ۔

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

تک مرہٹی ڈرامے بھی پیش کرتی رہی جن کے ناموں کی فہرست ڈاکٹر صاحب نے کتاب میں خود صفحہ ۱۸۷ — ۱۸۰ پر درج فرمائی ہے ۔

۱ ۔ اردو تھیٹر ، جلد اول ، صفحہ ۱۹۲ — ۱۹۳ ۔

۲ ۔ اردو تھیٹر ، جلد اول کے صفحہ ۳۲۸ پر اس کا یہ نام لکھا گیا ہے :

"حاجی میاں اور ان کے ملازمین فضل اور تیکھے خان ۔"

۵ - پٹھان صغریز[1] اور گلو[2] مع نقل علاؤالدین اور بانو زلیخا ۔
۶ - سینا کی شادی مع رام لیلا ۔

آگے چل کر کامک[3] کے عنوان کے نیچے ڈاکٹر نامی نے ۱۸۵۳ع اور ۱۸۵۴ع کے مندرجہ ذیل اردو کامکوں کا اضافہ فرمایا ہے :

۷ - "شریمنت جی کا کامک" اردو کا پہلا کامک تھا جو "راجہ گوپی چند اور جلندھر" کے ساتھ ۲۶ نومبر ۱۸۵۳ع کو پہلی بار دکھایا گیا ۔

۸ - "تیکھے خان شمشیر بہادر کا کامک" ۶ مئی ۱۸۵۴ع کو "شیوکس کی پیدائش" کے بعد دکھایا گیا ۔

نامی صاحب نے ڈراموں کی جو ترتیب رکھی ہے ، اس میں اور محترمہ میمونہ صاحبہ کی ترتیب اور بعض دوسری تفصیلات میں فرق ہے ، لیکن دونوں نے اپنی اپنی ترتیب کیونکر قائم کی ؟ اس کے متعلق چونکہ کوئی حوالہ نہیں دیا اس لیے یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں کہ کس کی فہرست مستند قرار دی جا سکتی ہے ۔ غالباً محترمہ میمونہ بیگم کی ، کیونکہ ڈاکٹر نامی نے مندرجہ بالا فہرست درج کرنے کے بعد یہ فقرہ لکھ کر اپنے سارے بیان پر خود ہی پانی پھیر دیا ہے :

"یہ ڈرامے (جن سے ڈاکٹر نامی کی مراد ہے : ۱ - شیوکس کی پیدائش - ۲ - تیکھے خان شمشیر بہادر - ۳ - حاجی میاں

---

۱ - اردو تھیٹر ، جلد اول کے صفحہ ۳۲۸ پر اسے صغریز لکھا گیا ہے ۔

۲ - اردو تھیٹر جلد اول کے صفحہ ۳۲۸ پر اسے 'گلو' لکھا گیا ہے ۔

۳ - اردو تھیٹر ، جلد اول ، صفحہ ۳۲۸ -

اور ان کے ملازمین فضل اور تیکھے خاں - ۴ - حاجی میاں مع نقل کلال خانہ - ۵ - پٹھان صغریز اور گلو مع نقل اللہ دین اور بانو زلیخا) مرہٹوں اور پارسیوں نے لکھے تھے۔ ان کے متعلق ابھی تک کوئی معلومات حاصل نہیں ہو سکی ہیں [1]۔ ممکن ہے کہ انھوں نے یہ ڈرامے اپنی مادری زبان میں لکھے ہوں اور بعد میں کسی منشی سے اصلاح لی[2] ہو"۔

یوں ڈاکٹر نامی کی دونوں فہرستوں کے آٹھ کھیلوں میں سے "گوپی چند اور جلندھر" اور "شرینمت جی" اور "سیتا جی کی شادی مع رام لیلا" صرف تین ایسے کھیل رہ جاتے ہیں جن کی زبان کے متعلق ڈاکٹر نامی صاحب نے واضح طور سے "اردو" کا لفظ استعمال کرنے میں مضائقہ نہیں سمجھا - لیکن جیسا کہ محترمہ میمونہ بیگم کی فہرست کے سلسلے میں لکھا جا چکا ہے ، ان تینوں ڈراموں کے موضوع کا خیال کر کے انھیں اردو ڈرامے قرار دینے میں تامل ہوتا ہے - قرین قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ڈرامے ہندی میں ہوں گے - ان کی زبان کے متعلق ہندوستانی[3] (اردو) کا لفظ تو ڈاکٹر نامی صاحب خود استعمال کر گئے ہیں - انھوں نے اپنی معلومات غالباً مرہٹی ،

---

۱ - ایسی صورت میں ان ڈراموں کا تذکرہ زیادہ محتاط الفاظ میں کیا جانا چاہیے تھا -

۲ - اگر یہ ڈرامے کسی منشی سے اردو میں ترجمہ کرائے گئے تھے تو اصلاح کے کیا معنی ؟ اور اگر اصلاح اپنی ہی زبان میں کی گئی تھی تو منشی کے تذکرے کا کیا موقع ؟

۳ - اردو تھیٹر ، حصہ اول، صفحہ ۱۸۰ - صرف یہاں 'اردو' کا لفظ ڈاکٹر نامی نے استعمال کیا ہے -

گجراتی اور انگریزی تصانیف و اخبارات و رسائل سے فراہم کی ہوگی ۔ ان مصنفوں اور اڈیٹروں کے نزدیک اردو ، ہندوستانی اور ہندی ایک ہی زبان کے تین نام ہوں گے ۔ چنانچہ انھوں نے جس زبان کو ہندی یا ہندوستانی قرار دیا ، ڈاکٹر نامی نے اُسے غالباً بلا تامل اردو قرار دے دیا ۔ لیکن کوئی دلیل یا حوالہ بھی تو ہونا چاہیے جس سے یقینی طور پر معلوم ہوسکے کہ ان ڈراموں کی زبان ہندی نہیں بلکہ اردو تھی ۔ "سیتا جی کی شادی مع رام لیلا" میں "مع" کا عربی لفظ ضرور آیا ہے جو ہندی میں نہیں بلکہ اردو میں مستعمل ہے ، لیکن میں ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ تھیٹریکل کمپنیوں میں اردو تماشے کے بعد جب کبھی کوئی نقل دکھائی جاتی تھی تو اشتہار میں "مع" کا لفظ کبھی استعمال نہیں کیا جاتا تھا ۔ گمان غالب ہے کہ نامی صاحب نے "and" کا ترجمہ "مع" خود کر لیا ہے ۔

بہر حال مندرجہ بالا بیانات سے اتنی بات ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ ہندی یا اردو ڈرامے سے مرہٹوں کا تعلق خاص حالات کے ماتحت بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بعض مجبوریوں کے باعث بہت تھوڑے سے عرصے کے لیے پیدا ہوا اور ضرورت رفع ہونے کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ۔

لیکن اردو ڈرامے کے سلسلے میں بمقابلہ مرہٹوں کے بہت زیادہ قابل قدر اور نتیجہ خیز کوششیں اُن کے ہم وطن پارسیوں کی رہیں ۔

یہاں پارسیوں کے متعلق اتنا بتا دینا بے محل نہ ہوگا کہ جب مسلمانوں نے ایران فتح کیا تو زرتشت کے جن پیروکاروں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا ، وہ ہجرت کرکے ہندوستان آ گئے ۔ یہاں اُنھوں نے گجرات (کاٹھیاواڑ) میں پناہ

حاصل کی اور کئی صدیوں تک وہیں قیام پذیر رہے ۔ بعد (ایسٹ انڈیا) کمپنی کی دعوت سے فائدہ اٹھا کر بمبئی میں آباد ہو گئے ۔ یہاں کی زمین اور آب و ہوا انھیں اتنی راس آئی کہ یہی شہر نہ صرف اُن کا دوسرا وطن بنا بلکہ وہ اس شہر کی تقدیر کے مالک بن گئے ۔

مسز پوسٹنز ، جو ۱۸۳۸ع میں بمبئی میں تھیں[1] ، پارسیوں کی اولوالعزمی کے متعلق لکھتی ہیں :

بمبئی کی قابل فخر اشیا میں یہاں کی بندرگاہ اور اس سے ملحقہ گودام ہیں ۔ یہ گودام بڑے وسیع ہیں اور عمدہ پتھر سے تعمیر کیے گئے ہیں ۔ انھیں پارسی معماروں نے بنایا ہے جن میں سے زیادہ تر اپنی قابلیت اور محنت کے باعث عام مزدور سے ترقی کر کے اکثر پتی جہاز ساز بن چکے ہیں ۔"

پارسیوں نے ۱۸۵۱ع سے انگریزی ڈراموں میں شوقیہ کام کرنا شروع کیا ، پھر اپنی زبان میں گجراتی کے ڈرامے پیش کیے اور بالآخر اردو ڈراموں کی طرف راغب ہو گئے ۔ اردو ڈرامے کی سرپرستی اختیار کرنے سے پہلے ان کے ڈرامے کی خدمت کے کچھ حالات بہت اختصار سے یہاں بیان کرنا غالباً بے محل نہ ہو گا ۔

ابتدا[2] میں ڈرامے کی تحریک کا تعلق شوقیہ کام کرنے

---

۱ ۔ ان کے بمبئی میں موجود ہونے کا ذکر لفٹننٹ کرنل ایچ اے نیول نے اپنی کتاب "بمبئی" میں کیا ہے ۔

۲ ۔ "انڈین ڈراما" پبلیکیشن ڈویژن ، منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ ، طبع دوم ، صفحہ ۵۷—۵۸ ۔

والے پارسی نوجوانوں سے تھا ۔ ایکٹر، ڈراما نویس اور دوسرے لوگ ، جو اس تحریک سے تعلق رکھتے تھے ، وہ دن میں روزی کمانے کے لیے اپنے اپنے کاموں میں جُتے رہتے لیکن شام کے وقت ڈرامے کی خاطر سب کے سب کہیں اکٹھے ہو جاتے تھے۔ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُن کی فاتھو وقت کی دلچسپی ہوگی لیکن اصل بات یوں سمجھیے کہ وہ اُس سے زیادہ اہم کام اور کوئی نہ سمجھتے تھے ۔

"ان میں سے اکثر ایکٹر ، ڈراما نویس اور دوسرے لوگ جن کی اخلاقی و مادی امداد شامل تھی ، وہ بخوبی تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ اُن میں سے بعض اپنے اپنے حلقۂ اثر میں بہت ذی اثر بھی تھے ۔ مثلاً دادا بھائی نورو جی جیسا عظیم شخص ، جو ہند کی ہوم رُول کی تحریک کا بانی تھا ، ڈرامے کی اولین کلب کی مشاورتی کمیٹی کا ممبر تھا ۔"

"ڈرامے کی پہلی کلب ۱۸۵۲ع میں 'پارسی ناٹک منڈلی' کے نام سے قائم ہوئی ۔ یہ کلب پندرہ سال کے لگ بھگ ڈرامے کی خدمت سرانجام دیتی رہی۔ دس سال کے عرصے میں ایسی ہی بیس اور جماعتیں بن گئیں لیکن ان میں سے بہت کم میں اتنا دم تھا کہ زیادہ عرصہ قائم رہ سکتیں ۔"

الفنسٹن ناٹک منڈلی ، بمبئی کی پرانی اور نامور ناٹک منڈلی تھی ۔ انگریزی ادب کے نصاب میں شیکسپیئر سے متاثر ہونے کے بعد الفنسٹن کالج بمبئی کے پارسی طلبا نے ۱۸۶۱ع میں پہلے پہل اِسے الفنسٹن ڈریمیٹک کلب کے نام سے قائم کیا تھا ۔ اِسے سی ۔ ایس ناظر نے ہیرجی کھمباتا اور تھیئٹر کے بعض دوسرے ایسے ہی حضرات کے ساتھ مل کر قائم کیا تھا ۔"

رفتہ رفتہ شوقیہ کام کرنے والوں کی اس کلب نے مختلف تماشے باقاعدہ دکھانے والی کمپنی کی صورت اختیار کر لی[1] -

اگرچہ یہ کلب ابتدا میں صرف شوقیہ کام کرنے والے فن کاروں کی تھی لیکن اس نے بمبئی میں تھیٹر کے فن کو زندہ رکھنے کے لیے کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی - شیکسپیئر کے کئی ڈرامے بہت شاندار انداز میں پیش کیے اور تماشائیوں سے بہت داد وصول کی - اس کے علاوہ بعض دوسری ڈراما کلبیں بھی تھیں جنھیں پارسیوں نے چلایا -

انھی پارسیوں میں ایک شخص کیخسرو نادرجی کابراجی قابل ذکر ڈراما نگار، شاعر اور موسیقی‌دان تھا، جس کی رائے دانشوروں کے نزدیک وزن رکھتی تھی[2] - اس نے تاریخ ایران میں سے ڈرامے اخذ کر کے گجراتی ڈرامے کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر دیا - اس کا پہلا ڈراما "بیزن و منیزہ" تھا جس نے بے حد شہرت حاصل کی -

"گجراتی ڈرامے کے ابتدائی بانیوں میں سے ایڈل جی، جے کھوری ابھی تک بقید حیات ہیں[3] - وہ (بمبئی سے رنگون چلے گئے جہاں وہ) بیرسٹر تھے، اب لندن میں سکونت پذیر ہیں -"

وہ بھی غیر معمولی صلاحیتوں کے ڈراما نگار تھے اور کابرا جی سے گہری وابستگی رکھتے تھے - انھوں نے اپنی ڈراما نویسی کا آغاز ھجم آباد اور تھگنا نامی مزاحیہ تصوراتی ڈرامے سے کیا تھا -

---

۱ - انڈین ڈراما، طبع دوم، صفحہ ۵۹، ۵۸ -

۲ - انڈین ڈراما، طبع دوم، صفحہ ۵۸ -

۳ - یہ اطلاع ۱۹۲۰ع کی ہے -

ڈرامے سے غیر معمولی دلچسپی رکھنے والوں میں سے ایک صاحب کنوور جی سہراب جی ناظر تھے ۔ یہ آخر میں الفنسٹن ڈراما کلب کے مالک بن گئے اور جب اس کلب نے پیشہ ور کمپنی کی صورت اختیار کی اسے اسے خوبی سے چلاتے اور بمبئی کے ڈرامے کے شائقین سے اپنی محنت اور دلچسپی کی داد وصول کرتے رہے ۔ ان کا نام خصوصیت سے اس لیے بھی قابل ذکر ہے کہ انھوں نے بمبئی میں انگریزی اور گجراتی کے بعد اردو تھیٹر کی خدمات بھی سر انجام دیں ۔ لیکن ان کے متعلق محترمہ میمونہ بیگم اپنے مقالے میں نہ ایک عجیب بات تحریر فرماتی ہیں کہ "۱۸۶۱ع میں جب الفنسٹن کالج ناٹک منڈلی" قائم کی گئی تو اس کے قیام و بقا میں کوور جی سہراب جی ناظر نے بڑی سرگرمی کا اظہار کیا ۔ اسی شوق کی وجہ سے وہ تعلیم سے بد دل ہو گیا تھا ۔ بڑی مشکلوں سے ۱۸۶۲ع میں میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا اور پھر تعلیم کو خیرباد کہہ دیا" ، یعنی کالج میں سرے سے داخل ہی نہیں ہوا ۔ ایسی صورت میں وہ الفنسٹن کالج کی ڈرامیٹک کلب کا نہ صرف روح و رواں بلکہ مالک کیونکر بن گیا !

ڈاکٹر نامی نے بھی اس گتھی کو نہیں سلجھایا ۔ کالج کے کلب کے نامور طلبا کے نام بیان کرنے کے بعد وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں : "ایک صاحب کنور جی ناظر بھی تھے جو اس فن سے دلی شغف رکھتے تھے ۔ ان کا ناٹکی شوق جنون کی حد تک بڑھا ہوا تھا ۔ کالج کے بعد وہ اپنے گھر پر بھی ریہرسل چلاتے اور ڈرامے تیار کرتے تھے ۔ انھوں نے پارسی الفنسٹن ڈرامیٹک کلب کے نام سے ایک بورڈ اپنے گھر پر بھی

لگا رکھا تھا جو دھوبی تلاؤ پر واقع تھا۔ وہ خود اس کے ڈائریکٹر اور ممبر تھے۔ کنورجی کے دوست اور ہم عصر اُن کے کاموں میں مدد کرتے تھے۔ اس کلب نے متعدد انگریزی ڈرامے اسٹیج کیے۔"

اس بیان کے الفاظ سے بھی یہ بات واضح نہیں ہونے پاتی کہ کُوور جی ناظر کالج کے طالب علم تھے یا کالج سے باہر رہتے ہوئے ڈرامے سے غیر معمولی دلچسپی رکھنے کے باعث، کالج کے کلب میں کسی حیثیت سے شامل کر لیے گئے تھے۔

افسوس ہے کہ کوورجی ناظر کے حالات زندگی تلاش کے باوجود دستیاب نہ ہو سکے۔ اتنا علم ہے کہ انھوں نے شیکسپیئر کے کھیل "دی ٹیمنگ آف دی شریو" (The taming of the Shrew) میں کیتھرین (Katherine) کا زنانہ پارٹ کیا تھا جس سے خیال ہوا تھا کہ ان کا قد چھوٹا یا درمیانہ[1] اور ناک نقشہ خوشگوار ہو گا۔ بہرحال کوورجی ناظر کو خود بھی تھیٹر کا جنون تھا، اُن کے احباب بھی اسی جنون میں مبتلا تھے۔ تماشے کی تعلیم چلانے سے لے کر تماشا پیش کرنے تک کے جملہ مراحل کا اہتمام یہ خود اور ان کے احباب کرتے تھے۔

بمبئی کے پارسی پہلے گجراتی کے کھیل دکھاتے رہے۔ پھر جب اردو ڈرامے کے اصلی محسن دادا بھائی سہراب جی پٹیل ایم اے میدان میں آئے تو انھوں نے اردو تماشے دکھانے

۱۔ دیکھیے اردو تھیٹر جلد اول صفحہ ۲۵۳۔ مگر میمونہ سلطانہ اپنے مقالے میں انھیں شکیل ہونے کے ساتھ ساتھ طویل قامت بھی لکھتی ہیں!

۲۔ ماخوذ از انڈین ڈراما، صفحہ ۶۱۔

شروع کر دیئے۔

دادا بھائی سہراب جی پٹیل ، جو عام طور سے دادی پٹیل[1] کہلاتے تھے ، ایک نامور و ممتاز ملک التجار سہراب جی فردون جی پٹیل کے بیٹے تھے۔ ایم اے تک تعلیم پائی تھی ڈرامے میں بے حد دلچسپی رکھتے تھے ، چنانچہ کالج کی تعلیم کے دوران میں کئی بار انگریزی ڈراموں میں پارٹ بھی کرتے رہے۔ انگلستان کا سفر بھی کر چکے۔ تھے بمبئی اس زمانے میں تھیٹر کے شائقین کا اکھاڑا بنا ہوا تھا۔ تفریح کی تفریح تھی ، کاروبار کا کاروبار۔ چنانچہ دادی پٹیل بھی کمر ہست کس کر اس میدان میں اتر آئے۔ بمبئی کے ایرانیوں نے ایک زرشتین ناٹک منڈلی بنائی تھی ، اس کا ڈائریکٹر بن کر ۱۸۷۰ع میں پہلے "رستم و سہراب"[2] اور پھر "رستم برجور" فارسی میں پیش کیا۔ پھر دلچسپی کے کسی زیادہ بڑے میدان کی تلاش ہوئی۔

بمبئی کے شوقیہ کام کرنے والے پارسیوں نے گجراتی کھیل پیش کرنے کے لیے "کرت شالا تھاپک منڈلی" نام کی ایک کلب بنا رکھی تھی ، اس کے معاملات کی دیکھ بھال کے لیے جو کمیٹی مقرر تھی اس کمیٹی نے ۱۸۶۷ع - ۱۸۶۸ع میں اس منڈلی کا نام بدل کر وکٹوریا ناٹک منڈلی رکھ لیا[3]۔

۱۸۶۹ع میں جب کمیٹی کے سیکرٹری کاؤس جی کابرا جی نے استعفٰی دیا تو ان کی جگہ دادی پٹیل نے لے لی۔ دادی پٹیل

---

۱ - صرف ۳۱ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا (انڈین ڈراما ، صفحہ ۵۳)۔

۲ - اردو تھیٹر ، جلد اول ، صفحہ ۲۵۶ -

۳ - اردو تھیٹر ، جلد اول ، صفحہ ۲۶۳ ، ۲۶۲ -

خود رائے آدمی واقع ہوئے تھے - سیکرٹری بنتے ہی من مانی کارروائیاں کرنے لگے - اس پر کمیٹی کے ممبروں نے بگڑ کر استعفٰی دینے شروع کر دیے - کمیٹی کا کوئی ممبر بھی باقی نہ رہا تو ۱۸۷۰ع میں دادی پٹیل اس منڈلی کو خرید کر اس کے واحد مالک بن گئے[1] -

دادی پٹیل اگرچہ پارسی تھے مگر کاروباری مزاج رکھنے کے باعث عرصے سے اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ بمبئی کی کمپنیوں کے لیے مرہٹی اور گجراتی کی بجائے اردو ڈرامے[2] پیش کرنا زیادہ منفعت بخش ہے - چونکہ ہر علاقے کے خواص و عام اردو اگر بے تکلفی اور روانی سے بولنے پر قادر نہیں تو کم از کم سمجھ بخوبی لیتے ہیں ، اس لیے تماشے اردو میں پیش کرنے سے تماشائیوں کی تعداد بہت بڑھ جانے کی امید کی جاسکتی ہے -
اس سلسلے میں جہانگیر پسٹن جی کھمباتا بیان کرتے ہیں :[3]

"اس سے قبل جو ڈرامے پیش کیے جاتے تھے ، وہ انگریزی ، مراٹھی ، بنگالی یا گجراتی زبان کے ہوتے تھے اور انہیں دیکھنے کے لیے صرف پارسی ، مرہٹے اور انگریز آتے

---

۱ - اردو تھیٹر حصہ اول ، صفحہ ۲۶۱ -
۲ - "اردو اسٹیج پارسیوں کی تخلیق تھی-" انڈین تھیٹر صفحہ ، ۹۷ -
"پارسیوں کی منڈلیوں نے رفتہ رفتہ گجراتی پر اردو کو ترجیح دنی شروع کردی" (انڈین ڈراما ، صفحہ ۵۷) - "اردو کی سفری کمپنیوں کی دیکھا دیکھی بعد میں ہندی تھیٹر پیدا ہوا" (انڈین تھیٹر صفحہ ۱۰۲)
۳ - "میرے ناٹکی تجربات" میں سے ماخوذ - مترجمہ جناب عبدالخالق فاروقی صاحب -

تھے - اُس وقت مسلمانوں میں ڈراما دیکھنے کا شوق بالکل نہ تھا - آنجہانی دادا بھائی سہرابجی پٹیل ایم - اے ، جو وکٹوریا ناٹک منڈلی کے ڈائریکٹر تھے ، اُنھوں نے منڈلی کے مالکوں کو مشورہ دیا کہ وہ ایک ڈراما اردو زبان میں پیش کرنے کا تجربہ کریں ، مگر یہ مشورہ مالکوں کو پسند نہ آیا کیوں کہ اُس وقت کے تمام ایکٹر پارسی تھے اور وہ اردو نہ بول سکتے تھے صحیح اردو بولنے کی مشق کے لیے (ان کی رائے کے مطابق) ایک مدّت درکار تھی، لہٰذا اردو ڈراما لکھوایا بھی جاتا تو اُسے پیش کون کرتا ؟

"مگر ان رکاوٹوں کے باوجود سیٹھ دادا بھائی نے ہمت نہ ہاری اور اپنے خاص دوست مسٹر ایدل جی جمشید جی کھوری کو ، جو گجراتی کے ڈراما نویس تھے ، مشورہ دیا کہ وہ ایک ڈراما اردو زبان میں بھی لکھیں - مسٹر کھوری اردو زبان میں تو ڈراما نہ لکھ سکے لیکن اُنھوں نے دادا بھائی کے لیے "کاماونتی" نام کے ایک ہندو (معاشرت کے) ناول سے پلاٹ اخذ کر کے "سونانا مولنی خورشید" نام کا ایک ڈراما گجراتی زبان میں لکھ دیا - سوال کھڑا ہؤا کہ ہندوستانی زبان میں اس کا ترجمہ کون کرے - یہ سوال بڑا ٹیڑھا تھا لیکن جن صاحب نے اسے حل کیا ، وہ بھی ایک پارسی ہی تھے ، مگر اُن کا نام اب تک کسی کو معلوم نہیں ہونے پایا - انھوں نے یہ فرمائش کی تھی کہ ان کا نام پوشیدہ رہنا چاہیے ، لیکن آج میں اُن کا نام آپ کو بتائے دیتا ہوں - یہ وہ عظیم ہستی ہیں جو اردو زبان کے عالم ، فارسی زبان کے

اچھے خاصے ماہر ، ایک مشہور ادیب اور بمبئی کے گجراتی اخبار "راست گفتار" کے پہلے مالک سیٹھ بہرام جی فردون جی مرزبان تھے ۔ مرزبان آن جہانی کو کھیل اسٹیج پر لانے کا اچھا خاصا تجربہ تھا ۔ وہ اس کام میں بہت محنت کرتے اور پوری کوشش فرماتے کہ کھیل کو جس قدر بھی ممکن ہو ، دلچسپ بنایا جائے ۔ آن جہانی بہرام جی مرزبان نے "سونانا مولنی خورشید" میں جیسی اردو استعمال کی ، وہ اس سے کہیں زیادہ ادق زبان بھی لکھ سکتے تھے لیکن ایسا کرنے کے لیے انھیں فارسی اور عربی الفاظ استعمال میں لانے پڑتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ پارسیوں ، ہندوؤں اور بمبئی کے مسلمانوں کے لیے اس کا سمجھنا دشوار ہو جاتا ۔ اس وجہ سے انھوں نے (اس ڈرامے میں) روزمرہ کی اردو استعمال کی ۔ انھیں اردو زبان پر کتنا عبور حاصل تھا ، اسے اگر معلوم کرنا ہو تو ان کا لکھا ہوا "سونانا مولنی خورشید" کا دیباچہ ملاحظہ فرمائیے ۔

"اس اردو کھیل کے شروع ہوتے ہی ہندوستانی تماشائی اسے دیکھنے کو ٹوٹ پڑے ۔ سب سے زیادہ دلچسپی بوہرہ بھائیوں نے لی ، ان کے ساتھ کھوجا اور میمن بیوپاریوں نے بھی اس میں بہت دلچسپی ظاہر کی ۔ کھیل اتنا کامیاب رہا کہ جسے دیکھیے اس کی زبان پر منڈلی کی اسی پیش کش کا چرچا تھا ۔ اس کھیل کے اہم کرداروں پر لوگ پھول برساتے ، کھوجے اور میمن بیوپاری اور پارسی سیٹھ انھیں اپنی گھوڑا گاڑی میں تفریح کو لے جاتے اور طرح طرح کے تحائف پیش کرتے ۔

اُس زمانے میں بمبئی کی چوٹی کی منڈلی الفسٹن ڈرمیٹک کلب تھی جس کے مالک کُوور جی ناظر تھے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ وکٹوریا ناٹک منڈلی کی اردو پیش کش کو اس قدر شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی تو خود بھی ایک اردو کھیل ، جو واجد علی شاہ[1] کی "اندر سبھا" سے ماخوذ اور شروع سے آخر تک گانوں پر مشتمل تھا ، پیش کیا ۔ اس میں سبز پری کا پارٹ حسن خوب صورت پارسی لڑکے کو دیا گیا تھا ، وہ جوان ہونے کے بعد اب حیدرآباد دکن میں بہ حیثیت ایک بیرسٹر کے کام کر رہا ہے ۔

"اگر پارسی بمبئی میں ڈرامے کا آغاز اور پہلا اردو کھیل پیش کرنے کی جرأت نہ کرتے تو شاید آج پورے ہند میں نہ اردو ڈراموں کا چرچا ہوتا ، نہ مراٹھی اور گجراتی کھیل اِس حد تک مقبول ہوتے جس حد تک آج ہیں ۔ پارسی چوں کہ ناٹک کے کام میں بہت زیادہ تجربہ رکھتے تھے ، اس لیے ڈراما وہی خوبی سے پیش کرسکتے تھے ۔ اب مجھے یہ بیان ختم کر دینا چاہیے ورنہ لوگ مجھے خود ستائی کا طعنہ دیں گے ۔"

لیکن مسٹر کھمباتا کے ہم عصر سر ڈی ۔ ای واچا ، پارسی ہوتے ہوئے اپنی قوم کے ابتدائی تھیٹر کے متعلق بہت مختلف رائے رکھتے ہیں ۔ وہ فرماتے ہیں[2] :

"اگر ہند کی عروس البلاد بمبئی میں برطانوی تہذیب کی

---

۱ ۔ امانت کی جگہ نواب واجد علی شاہ کا نام کسی غلط فہمی کی بنا پر لکھا گیا ہے ۔

۲ ۔ مائی رکولکشنز آف بمبئی ، صفحہ ۲۳۵ ۔

ایک صدی گزر جانے کے باوجود ، آج بھی ادب ، فن
اور موسیقی کا اِس قدر شدید فقدان ہے تو قارئین نصف
صدی پہلے یہاں فنون لطیفہ کی خستہ حالی کا اندازہ
بہ خوبی کر سکتے ہیں ۔ ممکن ہے کہیں کہیں شعر و ادب
کا اکا دکا پرستار موجود ہو اور اُس نے انفرادی طور پر
فنون لطیفہ کی خدمت بھی کی ہو ، لیکن مجموعی طور پر
یا فرداً فرداً بمبئی کے ہوس زر میں گرفتار شہریوں پر
اُن کا بالکل کوئی اثر نہ تھا ۔ گاہے گاہے شوقیہ فن کار
کوئی ڈرامے اسٹیج کرنے کا انتظام کرتے جس میں برطانوی
ڈرامے کی نقل کی جاتی لیکن یہ سب کچھ وقتی ہوتا ۔
پچاس برس پہلے کے شب گرفتہ بمبئی میں ڈرامے کے بتدریج
اور باقاعدہ ذوق کی نمو کو تصور میں لانا کسی طرح ممکن
نہ تھا ۔"

واقعہ یہ ہے کہ پارسیوں نے ڈرامے کی عموماً اور اردو
ڈرامے کی خصوصاً جو بے نظیر خدمات سرانجام دی ہیں ، وہ
ہمیشہ یادگار رہیں گی اور ڈرامے سے دلچسپی رکھنے والے
اردو دان کبھی اُن کے اس احسان کو فراموش نہ کرسکیں گے ۔
پارسیوں کی عالی ہمتی اور اولوالعزمی نے اردو میں جدید ڈرامے
کا نہ صرف باقاعدہ آغاز کیا بلکہ ایک طرف برعظیم کے متعدد
شہروں میں ادب کی اس اہم ترین صنف کا ایسا ذوق پیدا کیا
کہ کئی مقامات میں اردو تماشے دکھانے کی تھیٹریکل کمپنیاں
قایم ہوگئیں ، دوسری طرف بیرون برعظیم جہاں پہنچے وہاں کے
لوگوں کو ڈرامے کے ذریعے اردو سے روشناس کرنے کی بے حد
قابل قدر خدمت انجام دی ۔

اتنی بات میں تو غالباً کسی کو اختلاف کی گنجائش نظر نہ

آنے گی ۔ لیکن اس سے آگے بعض امور کے متعلق شاید اتفاق رائے نہ ہو ۔ ڈرامے کی طرف جن پارسیوں نے ابتدا میں توجہ کی ، وہ سب شوقیہ کام کرنے والے تعلیم یافتہ حضرات تھے ۔ گمانِ غالب ہے کہ یہ لوگ جب تک ایک کلب کی صورت میں کام کرکے اپنی نصابی کتب کے ڈرامے پیش کرتے رہے تو انھوں نے ڈرامے میں صحیح قسم کی مخلصانہ دلچسپی لی ہوگی ، لیکن بعد میں جب تھیٹر کا دھندا پیشے کے طور پر اختیار کر لیا تو ان کی سرگرمیوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ توجہ اس بات پر صرف ہونے لگی کہ اپنے کاروبار کو کامیاب اور زیادہ سے زیادہ منفعت بخش کیوں کر بنایا جائے[1] ۔ اس خیال کے ماتحت انھوں نے اپنے تماشوں میں پرتکلف سین سینری[2] کی ایسی حیرت افروز باتیں عموماً پیدا کرنی شروع کر دیں جنھیں دیکھ کر تماشائی دنگ رہ جائیں اور جوق در جوق تماشا دیکھنے کے لیے آئیں ۔ چنانچہ اسٹیج پر مشینری کی امداد سے کبھی جادو اور طلسم کے ایسے محیّرالعقول مناظر دکھائے کہ تماشائی ہکا بکا رہ گئے ، کبھی اندر سبھا کا تماشا پیش کرنے کے لیے گانے والے خوب رُو اور ایسے ذہین بچے فراہم کیے جنھیں اسٹیج پر بالغوں کی طرح عشق و محبت کے جذبات ادا کرتے دیکھ کر لوگوں کو بڑا اچنبھا ہوا ۔ غرض اس طرح لوگوں میں تھیٹر سے زیادہ تحیّر افروز تماشوں کا چسکا ضرور پیدا کر دیا لیکن

---

۱ ۔ پارسیوں نے اسٹیجی فن کے بڑے حوصلہ آزما تجربے کیے لیکن اس فن کو اتنا زیادہ کاروباری بنا دیا کہ اس کی اعلیٰ و ارفع نشو و نما کی صورت نہ رہی ۔ (انڈین تھیٹر ، صفحہ ۹)

۲ ۔ اس زمانے میں پرتکلف سین سینری تیار کرنے والا شخص بمبئی میں دادی رتن جی لال تھا ۔ (انڈین تھیٹر ، صفحہ ۹۷) ۔

ڈرامے کا صحیح ذوق پیدا کرنے میں زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکے ۔ یہ بات صرف بمبئی کے پارسیوں ہی سے مخصوص نہیں بلکہ مغرب کے کئی ممالک کے کاروباری لوگوں نے جب تھیٹر کے دھندے کو شو بزنس کے طور پر اختیار کیا تو اُن سب کی کوششیں بھی کچھ اسی نوعیت کی تھیں ۔

بمبئی میں ایک غیر معمولی بات اَور بھی تھی ، اگر اس کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو بہت واضح طور سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر میں صحیح قسم کا ایسا ڈراما ، جو ذوق سلیم کے لیے سرور بخش اور کیف آور ہو ، پیدا ہونے کا کوئی امکان نہ تھا ۔ چونکہ بمبئی کی تاریخ پر ضرورت کے مطابق کوئی کتاب اب تک نظر سے نہیں گزری ، اس لیے تحقیق پسند طلبا کی سہولت کے خیال سے کتاب کے آخر میں بمبئی کی تاریخ پر ایک ضمیمہ درج کر دیا گیا ہے ۔

اس ضمیمے کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ مغربی طاقتوں کی آمد سے پہلے یہ شہر ہند کے مغربی ساحل پر ابھی کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا تو سب سے پہلے ان ہی طاقتوں نے اس مقام کو دریافت کیا اور اس کی ترقی کے امکانات کا اندازہ کرکے اس پر قابض ہونے کی سرتوڑ کوششیں کیں ۔ یہ کوششیں اُس زمانے میں عمل میں آئیں جب مغلیہ سلطنت بے حد کمزور پڑ چکی تھی اور ملک میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا ۔ اُس زمانے میں اس شہر کو امن اور عام خوشحالی کے مسلسل ایسے چند برس بھی دیکھنے میسر نہ آ سکے جن میں کوئی نہ کوئی اندیشہ یا خدشہ سر پر سوار نہ ہوتا اور اہلِ علم و فن کو یہاں آنے اور آباد ہونے کی ترغیب ملتی اور یہاں کے حالات کسی قسم کی ثقافتی زندگی کی بنیاد پڑنے کے

لیے سازگار ہوتے۔ طرح طرح کی سیاسی چالوں کا شکار ہونے کے بعد بالآخر جب یہ شہر انگریزوں کے ہاتھ آیا تو انھوں نے بھی اسے صرف کاروباری نقطۂ نظر سے ترقی دینی چاہی۔ شہر میں ایسی کوئی خوبی یا خصوصیت نہ تھی جو غیر کاروباری لوگوں کو یہاں آنے اور آباد ہونے پر مائل کرتی۔ مالی منفعت کا لالچ صرف تاجروں، دلالوں اور مزدوروں ہی کو ادھر لانے میں کامیاب ہو سکا۔

انیسویں صدی کے ربع آخر میں جب بمبئی کا اردو ڈراما پیدا ہوا تو اس شہر میں اسکول اور کالج کھل چکے تھے، علم و ادب کا چرچا ہو گیا تھا، یہاں کے باشندے مغربی تہذیب سے بہت زیادہ متاثر ہو رہے تھے۔ لیکن بھانت بھانت کے لوگ مختلف علاقوں اور شہروں سے آ کر جمع ہوئے تو اُن کی طرح طرح کی بولیوں اور بہت مختلف طور طریقوں کے باعث (یعنی کوئی ایک تہذیبی و تمدنی پس منظر نہ ہونے سے) آبادی میں کسی قسم کی یک رنگی یا وحدت پیدا نہ ہو سکی۔ طرح طرح کے کاروباری لوگ، جن کی نہ زبان ایک تھی، نہ شوق اور دلچسپیاں ایک سی تھیں، محض روپیہ کمانے کی دھن میں گویا ایک ہجوم کی صورت یہاں یکجا ہوگئے تھے۔ کمائی کے لیے صبح سے شام تک دیوانہ وار تگ و دو کرتے اور اس کے معاوضے میں جیبوں کا وزن بڑھانے کی دُھن میں لگے رہتے۔ ان حالات میں جو فنون لطیفہ یہاں پیدا ہوں وہ ایک خاص سطح سے اوپر نہیں جا سکتے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

تھیئٹر کے کاروبار سے تعلق رکھنے والوں کے مخاطب چونکہ زیادہ تر کاروباری لوگ تھے، کسی ایک برادری یا ایک خیال یا ایک رجحان کے لوگ نہ تھے، اس لیے سب کی

پسند اور دلچسپی کی بات کہنے کی فکر اور دردد میں وہ نہ کوئی کام کی بات کہہ سکتے تھے اور نہ صحیح طریق پر کہہ سکتے تھے چنانچہ یہاں کے ڈرامے کا انداز بنگال کے شہر کلکتہ کے ڈرامے کے انداز سے مختلف رہا[1] -

مندرجہ بالا صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے بمبئی کے اردو ڈرامے کی اکثر خصوصیات بخوبی سمجھ میں آ سکیں گی -

ڈرامے کا بہت گہرا تعلق تین چیزوں سے ہوتا ہے : تماشائیوں سے جو ڈراما دیکھتے ہیں ، ایکٹروں سے جو ڈراما کرتے ہیں اور اسٹیج سے جس پر ڈراما کیا جاتا ہے - بمبئی کے اردو ڈرامے کا متن پیش کرنے سے پہلے نامناسب نہ ہوگا اگر ان تینوں امور پر بہت اختصار سے اظہار خیال کردیا جائے کہ بمبئی کے ڈرامے پر بحیثیت مجموعی رائے قائم کرنے میں سہولت ہو -

بمبئی کے تماشائیوں یعنی وہاں کے باشندوں کے متعلق کرنل ایچ - اے - نیول لکھتے ہیں :

بمبئی[2] کو بلاتکلف بین الاقوامی برادری کا سب سے بڑا شہر قرار دیا جا سکتا ہے - یہاں طرح طرح کے رنگوں ، نسلوں اور مزاجوں کے لوگ آباد ہیں - انھیں اس جگہ اتنی زیادہ تعداد میں جمع دیکھ کر مینارۂ بابل کا واقعہ یاد آ جاتا ہے جس کے سائے سے انسانی برادری کے مختلف ٹولے قسمت آزمائی کے لیے کئی سمتوں میں بکھر گئے تھے-

---

۱ - کتاب کے آخر میں کلکتہ کے تھیئٹر پر گارساں دتاسی کا ایک مختصر نوٹ بطور ضمیمہ شامل ہے -

۲ - لفٹیننٹ کرنل ایچ - اے - نیول کی کتاب "بمبئی" سے میرے لیے جاوید شاہین صاحب نے ترجمہ کیا -

اس شہر کے باشندوں کی بین الاقوامی فطرت کی وجہ ان عجیب حالات میں مضمر ہے جن کے تحت یہ شہر پروان چڑھا اور جو پالیسی اس کی حقیقی بانی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اختیار کی۔

۱۶۶۵ء میں جب ہمفرے کُک بمبئی میں برطانوی تسلط کی علامت کے طور پر یہاں کی مٹی ہاتھ میں لے کر شہر کے قلعے کے برج پر چڑھا تو اُس وقت یہاں کی آبادی فقط دس ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ سات قسم کے تھے۔ سر فہرست پرتگیزی آبادکار تھے جن کے تقریباً گیارہ خاندان تھے اور جنھوں نے زمین کو جاگیردارانہ طور پر آپس میں تقسیم کر رکھا تھا۔ دوسرے درجے پر ہندوستانی نژاد پرتگیز تھے۔ تیسرے نمبر پر ایشیائی نسل کے مقامی عیسائی تھے جو اول الذکر لوگوں کے ہم مذہب ہونے کے سبب اُن سے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ چوتھے غریب کاشت کار تھے جو پریل اور سیون میں رہائش پذیر تھے۔ پانچویں فراسی تھے جو موجودہ بھنگی طبقے کے پیش رو تھے۔ چھٹے درجے پر ماہی گیر تھے جو قریبی جزیروں میں اور ساحل پر رہتے تھے آخر میں کھجور کے درختوں سے شراب کشید کرنے والے لوگ تھے جنھیں بھنڈاری کہا جاتا تھا۔ پھر اس فہرست میں انگریزوں کا اضافہ ہوا جن کے ہمراہ آئرستانی، ویلزی اور اسکاٹستانی یہاں آئے۔

جب بمبئی ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے میں آیا تو انگریز تاجروں نے ہر ممکن طریق سے بہتر قسم کے آبادکاروں کو یہاں آنے کی ترغیب دی۔ مذہبی آزادی اور بیرونی حملے کی صورت میں تحفظ کا وعدہ کیا گیا۔ ایک تو یہ وعدہ، دوسرے کمپنی کا استحکام اور اُس کی شہرت، علاوہ ازیں مغل دربار میں کمپنی

کا رسوخ اور عزت افزائی ، نیز بمبئی کا اطمینان بخش کاروباری محل وقوع، ان سب چیزوں کے باعث متمول لوگوں کے لیے بمبئی میں بہت کشش پیدا ہوگئی تھی -

یہاں کے ابتدائی آنے والوں میں بعض امیر بنیا تاجر تھے ، پھر برہمن آئے - مسلمان بھی ماہم میں ایک ولی کے مقبرے کی تلاش میں اِدھر آ نکلے - آرمینی اور یہودی ، چینی اور بُدھی ، گھوڑوں کے عرب سوداگر ، ایرانی تاجر ، عرب مولوی ، مصری سوداگر، تہی‌دست مہم‌باز ، متمول لوگ ، غرض ہر ایک اب بمبئی کو جائے امن سمجھ کر یہاں آباد ہوگیا - کمپنی کی پیش کش قبول کرنے والے ان عجیب و غریب لوگوں میں سب سے زیادہ پارسیوں کو خوش آمدید کہا گیا -

مسز پوسٹنز لکھتی ہیں کہ یہودی یہاں زیادہ تعداد میں موجود ہیں اور بمقابلہ ہندوستان کے کسی دوسرے حصے کے یہاں زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں - وہ اچھے سپاہی ہیں اور مقامی فوج میں اُن کی خاصی تعداد ہے - یہاں آرمینی بھی ہیں لیکن کلکتہ کے مقابلے میں بہت کم -

اٹھارویں صدی کے دوران میں مڈغاسکر کے غلاموں سے بندرگاہ اور فوجی‌تعمیرات میں کام لیا جاتا تھا - فوربز کے بیان کے مطابق وہ پارسی اور مسلمان امرا کے گھرانوں میں ملازمت بھی کرتے تھے - گھٹیا قسم کے کام البتہ مالاباری سرانجام دیتے تھے- اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں نئی قلعہ بندیاں بنانے کے لیے بہت سے جرمن کاریگر بھی‌مدعو کیے گئے - ۱۸۰۰ع تک چینیوں کے چھ یا آٹھ خاندان بمبئی کے اُس حصے میں آباد ہو چکے تھے جو بعد میں ڈونگری بازار کہلایا - اُنھوں نے اس قدر ترقی کی کہ جلد ہی صرف بھنڈی بازار میں ان کے پانچ

ہندو بن گئے۔

فرانسیسی سیاح لینگلز نے ہندوستان کے متعلق اپنی مشہور کتاب ۱۸۲۰ء میں پیرس سے شائع کی تھی، وہ بمبئی کے باشندوں کے مخلوط کردار کے متعلق یوں رقم طراز ہے:

"بمبئی کا ساحلی شہر تیس میل لمبا ہے اور اس کا محیط سات میل ہے، یہ بندرگاہ ہے۔ اس کی آبادی گنجان ہے، مگر پانی کی رسد کا انتظام ناقص ہے۔ بمبئی جب چارلس دوم کی تحویل میں آیا تو اس کی آبادی دس ہزار تھی۔ ۱۷۶۴ء تک یہ اعداد بڑھ کر ۶۰۰۰۰ ہوگئے۔ اب اس کی آبادی ۲۰۰۰۰۰ ہے جن میں سے ہندو تین چوتھائی ہیں، پارسیوں کی تعداد ۸۰۰۰ ہے، اتنی ہی تعداد میں مسلمان ہیں اور یہودی تقریباً ۴۰۰۰ ہیں۔ علاوہ بریں پرتگیز اور آرمینی بھی خاصی تعداد میں ہیں۔ بمبئی کا شہر ایران، عرب اور ہندوستان کے مغربی علاقوں کی نہایت اہم منڈی ہے۔ صنعت پر پارسیوں کا قبضہ ہے مگر بعض امیر پرتگیزی آرمینی اور ہندو بھی اس شعبے میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔"

زیادہ تر یہی لوگ بمبئی کے تھیئٹروں کے تماشے دیکھنے کو آتے تھے، چنانچہ تھیئٹروں کے کاروباری مالکوں کے لیے ان کی پسند اور مانگ کو نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ جو نودولتیے تماشے میں آ کر اگلی صفوں میں براجتے، ان کی تماشا دیکھنے کی تمیز نرالی تھی۔ کسی ایکٹر کا کام اگر جی کو بھا گیا تو بلا تکلف آواز دے کر یا اشارے سے اسے بلایا۔ تعمیل ارشاد میں جب وہ اپنا پارٹ ادھر ہی چھوڑ کر اسٹیج سے اترتا اور ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تو مجرے میں جس

طرح طوائفوں کو بیل دیتے ہیں ، اسی طرح اس ایکٹر کو نقدی کی صورت میں داد دی جاتی ۔ اسے شکریے کے ساتھ وصول کرنے کے بعد ایکٹر پھر اسٹیج پر چڑھتا اور پارٹ کو جہاں چھوڑ گیا تھا ، وہاں سے آگے شروع کر دیتا ۔ ایکٹر کو داد دینے کی یہ صورت کبھی انگلستان میں بھی رائج رہی ہے ۔

پرانے پارسی ایکٹروں کے کام پر جن حضرات نے قلم اٹھایا ہے ، انھوں نے لکھا ہے کہ فلاں فلاں ایکٹر اپنے کمال میں بے مثال اور تماشائیوں میں بے حد مقبول و محبوب تھے ۔ جن ایکٹروں نے بعض کردار اسٹیج پر زیادہ کامیابی سے ادا کیے ، عوام میں وہ اس کردار کے نام سے یاد کیے جانے لگے ۔ خواص نامی گرامی ایکٹروں کو خود نمائی کے لیے شام کے وقت اپنی فٹن گاڑیوں میں لے لے کر نکلتے اور تعلقات قائم رکھنے کے لیے انھیں تحفے تحائف بھیجتے رہتے تھے ۔ ان نامور ایکٹروں میں سے کاؤس جی کھٹاؤ ، سہراب جی اوگرا اور ٹھونٹھی کو میں نے اپنے لڑکپن کے زمانے میں جب وہ ادھیڑ عمر کو پہنچ چکے تھے ، دیکھا تھا ۔ یہ لوگ منجھے ہوئے ایکٹر تھے اور ان کا کام دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ ریاضت نے فن پر ان کی گرفت مضبوط کر دی ہے ، لیکن اس سلسلے میں قصیدہ خواں اور مبالغہ پسند حضرات کو چند باتیں نظرانداز نہیں کرنی چاہئیں ۔

ایک تو یہ کہ گو وہ ایکٹر آج دنیا میں نہیں ہیں لیکن جن ڈراموں میں انھوں نے پارٹ کیے وہ موجود ہیں بلکہ ایسے ڈرامے بھی موجود ہیں جن میں ، ان میں سے بعض نے، ملازم منشیوں سے خاص کردار اپنے لیے لکھوائے تھے ۔ مثلاً بالی والا نے منشی ونائک پرشاد طالب سے 'لیل و نہار' کے ڈرامے میں اپنے لیے اشرف کا پارٹ لکھوایا ، کھٹاؤ نے منشی مہدی حسن احسن سے

'خون ناحق' کے ڈرامے میں جہانگیر کا اور 'بزم فانی' کے ڈرامے میں فیروز کا پارٹ اپنے لیے لکھوایا ۔ سہراب جی اوگرا نے آغا حشر سے "خوبصورت بلا" کے ڈرامے میں اپنے لیے سرستلا کا اور "خواب ہستی" کے ڈرامے میں فضیحتا کا پارٹ لکھوایا ۔ ٹھونٹھی نے آغا حشر سے 'سفید خون' کے ڈرامے میں خاقان کا پارٹ اپنے لیے لکھوایا تھا یا نہ لکھوایا لیکن اُن کا یہ پارٹ بہت مقبول و معروف تھا ۔ مندرجہ بالا سب کرداروں کے جملوں کا مطالعہ کیا جائے تو اُن سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ کامیڈی میں کس ایکٹر کو کُھلا اور ارزاں مزاح مرغوب تھا اور ٹریجیڈی میں کون سا ایکٹر مناسب تحمل سے کام لینا نا پسند کرتا تھا ۔ علاوہ ازیں کون کون سے کردار سطحی اور کھوکھلے اور بے ہیئت قرار دیے جا سکتے ہیں ۔ یہ صحیح ہے کہ اچھے ایکٹروں کو کردار میں مناسب جملے نہ ملیں تو وہ بین السطور سے کچھ فائدے اٹھانے کی کوشش ضرور کرتے ہیں لیکن ایسی کوششیں کردار کو ایک حد تک ہی سنبھال سکتی ہیں ۔ کمزور متن کے بنیادی عیوب کو رفع کرنا کسی ایکٹر کے بس کی بات نہیں ۔

اصل میں ہمارے ابتدائی ڈرامے ایسے پیشہ ور منشیوں اور شاعروں نے لکھے تھے جو جدید یوروپین ڈرامے اور اُس کے تقاضوں سے اجنبی تھے اور ایکٹر کے لیے کوئی قابل قدر مواد مہیا کرنے سے سراسر قاصر تھے ۔

یہاں ایک اَور بات بیان کر دینی بھی ضروری معلوم ہوتی ہے ، وہ یہ کہ اُس زمانے میں اسٹیج پر ایکٹروں کے ڈراما بولنے کا بلند آہنگ اور اونچا نیچا لہجہ تھا ، اس کی نقل بعض پرانے ایکٹر عقیدت سے اور نئے خیال کے لوگ تفنن کے طور پر اتارتے ہیں ۔

اس انوکھے اور اوپرے انداز کے رواج پانے کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک تو منڈوے کے طویل و عریض ہونے کے باعث ضروری تھا کہ آواز آخری صف تک پہنچانے کے لیے جملے بلند آواز اور خطیبانہ انداز میں بولنے کی کوشش کی جائے مگر خطیبانہ انداز میں اردو ڈراما بولنے کی کوئی روایت موجود نہ تھی - چنانچہ اسے خود پیدا کرنے کی کوشش کی گئی - ابتدائی زمانے کے پارسی ایکٹروں نے شیکسپیئر کے ڈراموں کو بیرونی تھیٹریکل کمپنیوں میں اور یوروپین پروفیسروں سے رسمی انداز کی خطابت میں سنا ، چنانچہ اس کی نقل کرتے ہوئے ایک بارعب سا خطیبانہ انداز پیدا کرنے کی ضرورت کا شدت سے احساس ہوا - پھر ان ایکٹروں کی مادری یا گھریلو زبان اردو نہیں تھی ، چنانچہ اس میں گجراتی کے لہجے بھی دخل پا گئے - اور پھر آخری بات یہ کہ بولنے کو مقفلی عبارت ملی جس میں جملے بہ طریق احسن تماشائیوں تک پہنچانے میں قافیے کے لفظوں کو اٹھانا اور اجاگر کرنا ضروری معلوم ہوا - ان سب باتوں سے خطابت کی ایک عجیب معجون سی بن گئی جس کی بلند آہنگی بعض موقعوں پر ایک حد تک زور تو پیدا کر دیتی تھی لیکن اس میں اثر و تاثیر عموماً پیدا نہیں ہوتی تھی -

یہ واقعہ ہے کہ بعض نامور پارسی ایکٹروں نے محنت اور کوشش سے اردو لہجے پر حیرت انگیز قدرت حاصل کر لی لیکن عام پارسی ایکٹر لہجے کے اعتبار سے عرصے تک معذور ہی سمجھے جاتے رہے - ایک واقعے سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ایکٹنگ کی عالمی سطح پر ہمارے ایکٹر کیا حیثیت رکھتے تھے - ۱۸۸۵ع میں بالی والا اپنی کمپنی لندن لے گئے - اس کمپنی کو وہاں جو انتظامی مشکلات پیش آئیں

آن سے وطع نظر کرایا جائے اور محض اس کے تماشوں کے متعلق وہاں کے تماشائیوں کے رد عمل پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس کمپنی کو سخت ناکامی ہوئی ، اور یہ ہزار دشواری جب یہ ہند لوٹی تو اس کے کارکنوں پر فاقے گزر رہے تھے -

اس تذکرے سے مراد ان ایکٹروں کے کمال کو گھٹانا نہیں ہے بلکہ مبالغہ آرائی سے قطع نظر کرکے اسا یاد رکھنا چاہیے کہ ان ایکٹروں کو وقت نے پیدا کیا ، خلوص اور ریاضت نے وطن میں شہرت بخشی ، وہ عوام کے محبوب بنے اور با کمالوں میں شمار ہونے لگے - لیکن یہ فرض کرنا صحیح نہیں کہ ان لوگوں نے ایکٹنگ کے فن کو کمال کی حد تک پہنچا دیا - ان کے بعد آغا محمود ، رتن شاہ سینور ، سید علی اطہر ، محمد اسحق شباب ، داد بھائی سرکاری اور نواب اور شریفہ اور کئی دوسرے ایسے ایکٹر پیدا ہوئے جن کا فن اپنے پیش رووں سے بہت بڑھ چڑھ کر تھا -

بیان کیا جا چکا ہے کہ بمبئی کے فوجی اور سول محکموں کے انگریز اپنی دلچسپی کے لیے یوروپین تھیٹریکل کمپنیوں کو وقتاً فوقتاً بمبئی مدعو کرتے رہتے تھے - یہ کمپنیاں زیادہ چلتے ہوئے ایسے کھیل دکھاتی تھیں جو انیسویں صدی کے نصف حر کے انگلستان میں عوام کے تھیٹروں میں دش کیے جاتے تھے - انگلستان میں انیسویں صدی انقلابات کی صدی سمجھی جاتی ہے انقلابات کے ساتھ ایک نیا ان گھڑ مگر متموّل طبقہ پیدا ہو گیا - متموّل کے ساتھ تھیٹر کا تماشا دیکھنے والوں کی تعداد بڑھی - ان میں سے اکثر کا زیادہ وقت محنت و مشقّت میں بسر ہوتا تھا - گھڑی دو گھڑی کی دلچسپی میں اپنی تھکن اور کوفت دور کرنے کے لیے یہ لوگ جوق در جوق تھیٹروں میں

جانے لگے۔ ادھر ڈراما لکھنے اور پیش کرنے کے طریق میں بھی انقلاب آیا ۔ اس پر تفصیل سے بحث کرنے کا یہ موقع نہیں ۔ لیکن عوام کے تھیٹر پر اس انقلاب کا جو اثر پڑا وہ انگلستان کی سفری تھیٹریکل کمپنیوں اور بمبئی کے اُن لوگوں کی معرفت جو انگلستان آتے جاتے رہتے تھے ، یہاں پہنچا اور بمبئی کے تھیٹروں میں ایک حد تک اس کی نقل اتارنے کی کوشش کی گئی ۔

بمبئی کی سب نئی تھیٹریکل کمپنیوں کا اسٹیج بروسینیم چوکھٹے کا تھا ۔ اس کے معنی ہیں ایسے چوکھٹے کا جو سینری سے آگے اسٹیج کے اگلے سرے پر بنایا جائے کہ تماشائی اسٹیج پر جو کچھ بھی دیکھیں اس چوکھٹے کے اندر دیکھیں ۔ تماشا چونکہ ایک ہی جانب سے دیکھا جا سکتا تھا ، اس لیے اُسے اس طرح پیش کیا جانے لگا گویا ایک تصویر ہے جو تماشائیوں کے سامنے چوکھٹے میں حرکت کر رہی ہے ۔

چوکھٹے کے اوپر اسٹیج کی چوڑائی کے برابر مثلث بنا کر اس میں نقش و نگار کے درمیان عموماً فرمانروائے برطانیہ یا اُن کے خاندان کے دوسرے نامور افراد کی رنگین تصویر بنائی جاتی تھی ۔ اُس کے ارد گرد کمپنی کا نام انگریزی حروف میں لکھا جاتا تھا ۔ ڈراپ سین پہلے معمولی ہوتے تھے لیکن وکٹوریا منڈلی نے گجراتی کھیل جمشید کو اسٹیج پر لانے کا اعلان کیا تو اس موقع پر کاؤس جی کابرا جی نے ایک قدیم تاریخی تصویر سے نیا ڈراپ سین[1] اپنی نگرانی میں تیار کرایا جس پر اُس زمانے میں ڈیڑھ سو روپیہ خرچ آیا ۔ بعد میں ڈراپ سین پر

---

۱ ۔ ڈراپ سین کاؤس جی کابرا جی نے ایک قدیم تاریخی تصویر سے اپنی نگرانی میں تیار کروایا تھا ۔ (از مقالہ محترمہ میمونہ بیگم صاحبہ) ۔

ملاسوکی مغربی مصوروں کے بنائے ہوئے کسی ایسے رنگین گروپ کی نقل بڑے پیمانے پر تیار کی جانے لگی جس میں زیادہ تر حسین عورتیں خوش آئند انداز میں پیش ہوتی تھیں۔ یہ گروپ عموماً مصر، بابل، یونان اور روم کے رنگین نظاروں سے تعلق رکھتے تھے۔ ڈراپ سین کے دونوں طرف کے پلاٹوں پر بھی نقش و نگار کے فریم میں اسی نوع کی دکھاوٹ ہوتی تھی لیکن گنجائش کم ہونے کے باعث گروپ بہت مختصر یعنی تین یا دو افراد پر مشتمل ہوتے تھے بلکہ بعض اوقات تو صرف ایک ہی حسین عورت کسی دلکش کیفیت میں دکھائی جاتی تھی۔

ڈراپ سین کا نچلا سرا اسٹیج کی چوڑائی کے برابر لمبی بلّی پر میخوں سے جڑا ہوتا تھا۔ بلّی پچھلی جانب ہونے کے باعث تماشائیوں کو نظر نہ آتی تھی۔ اس کے دونوں سروں پر سوت کے بہت موٹے موٹے رسّے نیچے کاریگری سے بندھے ہوتے اور اوپر پُلیوں پر سے گزرتے تھے۔ ان رسّوں کو کھینچا جاتا تو پردہ بلّی کے گرد لپٹتا ہوا اوپر کی طرف اٹھ جاتا۔ ڈھیلا چھوڑتے تو بلّی کے گرد کھلتا ہوا نیچے اتر آتا تھا۔

کھیل کے کچھ مناظر پورے اسٹیج پر دکھائے جاتے تھے، کچھ مناظر کے پردے بلّیوں پر لپٹے ہوئے کنارے کے رسّوں کی امداد سے حسب ضرورت اسٹیج کے اگلے یا درمیانی حصے میں اوپر سے نیچے اترتے تھے۔ یا پھر اسٹیج کے دونوں جانب سے دو فلیٹ بڑھ کر درمیان میں باہم مل جاتے تھے اور منظر ختم ہونے پر پھر اندر کھینچ لیے جاتے تھے۔ ان فلیٹوں پر رنگین نقش و نگار عموماً یوں بنے ہوتے تھے گویا وال پیپر لگا ہے۔ حسب ضرورت درمیان میں ایک دروازہ اور دونوں جانب یا ایک جانب ایک کھڑکی ہوتی، ان میں یا کواڑ لگے ہوتے یا

چھپے ہوئے کپڑے کے صرف پردے ٹانگ دیے جاتے تھے ۔ جب تک کسی اگلے پردے یا فیٹ کے سامنے کوئی منظر پیش کیا جاتا ، پیچھے پوری اسٹیج کے بڑے منظر کو مرتب کرلیا جاتا ۔ دونوں پہلوؤں پر ایک دوسرے کے متوازی کئی پنکھ (ونگ) ہوتے تھے، سین بدلتا تو اسی پر چھپتے ہوئے پنکھ بڑھا کر سامنے کر دیے جاتے تھے ۔ دوسرے پنکھ اندر کھینچ لیے جاتے تھے ۔ یہ پنکھ دونوں جانب اسٹیج کے اندرونی حصے کی پردہ پوشی بھی کرتے تھے اور ان ہی کے درمیانی فاصلے سے ایکٹر بھی اسٹیج پر آتے جاتے تھے ۔

اگر پورے اسٹیج پر دکھانے کے دو منظر یکے بعد دیگرے ہوتے تو ایک منظر کو منقلب کر کے دوسرا منظر پیدا کیا جاتا تھا ۔ منظر سینری کے جن مختلف ٹکڑوں کو جوڑ کر بنایا جاتا تھا ، اُن میں سے کچھ پہلوؤں میں کھینچ لیے جاتے اور دوسرے ٹکڑے اندر بڑھا دیے جاتے تھے ، کچھ اوپر اٹھ جاتے اور اُن کی جگہ نئے ٹکڑے اوپر سے نیچے اتر آتے تھے ۔ کچھ ٹکڑے سامنے گر کر پچھلی چیز کو بے نقاب کر دیتے تھے، کچھ حصے گھما دیے جاتے تھے ، یوں گھمانے سے اُن کے پچھلے حصے سامنے آ جاتے تھے ۔ سینری کی تبدیلی کا یہ سارا عمل تماشائیوں کے سامنے ہوتا تھا ۔

اسٹیج کے اوپر کئی کئی جھالریں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ایک دوسرے کے متوازی ٹنگی رہتی تھیں ۔ جن جھالروں کی تصویریں اس سین کی ضرورت کے مطابق ہوتیں ، وہ دکھائی دیتی تھیں، باقی رسّوں کی امداد سے اوپر کھینچ کر نظروں سے اوجھل کر دی جاتی تھیں ۔ جھالریں اسٹیج کا فریم بنانے کے ساتھ اسٹیج کی چھت کو اور اسٹیج کی روشنیوں کو بھی بوقت ضرورت چھپائے

رکھتی تھیں ۔

اس زمانے میں بجلی کی روشنی نہیں تھی ، چنانچہ اسٹیج کو روشن کرنے کے لیے گیس کے ہنڈوں سے کام لیا جاتا تھا ۔ دن کے منظر میں انھیں اسٹیج کے بالائی حصے میں نیچے کر دیا جاتا تھا ۔ رات کا منظر ہوتا تو لوہے کے تاروں اور پلیوں کی مدد سے اوپر کھینچ کر جھالروں کی اوٹ میں کر لیا جاتا تھا ۔ اسٹیج کے کنارے پر گیس ہی کی روشنی کے ڈبے فٹ لائٹ کے طور پر برابر برابر رکھ دیے جاتے تھے ۔ منظر میں ان کی روشنی کی ضرورت نہ ہوتی تو اسٹیج کی جانب اوٹ کا ایک نو دس انچ اونچا تختہ کھڑا کر دیا جاتا تھا ۔ چونکہ اسٹیج کے اگلے حصے میں روشنی زیادہ ہوتی تھی اس لیے ایکٹر بھی ، خواہ منظر کے آغاز میں وہ اسٹیج کے پچھلے حصے میں بیٹھے ہوں ، ایکٹ کرنے کے لیے اٹھ کر اسٹیج کے اگلے حصے میں آ جاتے تھے ۔

جو ایکٹر ڈرامے کے سنجیدہ حصے میں پارٹ کرتے تھے ان کے لباس رسمی مگر پرتکلف ہوتے تھے ۔ مردوں کے سر پر اس انداز کی وگیں ہوتیں گویا پٹے رکھے ہوئے ہیں ، جسم پر ململ یا ریشم کا لباس جو گھٹنوں سے کچھ اوپر رہتا ، کمر پر پیٹی ، پیٹی سے نیچے لباس میں مناسب گھیر ، کسی لباس کی آستین نصف اور کسی کی پوری ، سارے لباس پر سنہری روپہلی کام ، نیچے دراز یعنی رانوں تک پہنچنے والے موزے ، پیروں میں پرتکلف چپلیں ۔ خاص کھیلوں میں عبا ، چغہ اور دستار اور ہندوانی کھیلوں میں ہندو لباس پہنا جاتا تھا ۔ عورتوں کا لباس گون نما ہوتا تھا ۔ سر ننگا ، بال عموماً کھلے ہوتے ، کبھی کبھی لمبی چوٹی پیچھے یا دو چوٹیاں سامنے ۔ مزاحیہ حصے میں مروجہ لباس پہنایا جاتا تھا ۔ مرد عموماً ٹوپی یا پگڑی اور

شیروانی یا کُرتا ، واسکٹ اور پاجامہ پہنتے ، عورتیں دوپٹہ ، کُرتا ، واسکٹ اور تنگ پاجامہ زیادہ تر پہنتی تھیں[1] ۔

تھیٹریکل کمپنیوں کا تماشا کرنے کا یہ انداز مغرب میں اصطلاحاً تھیٹریکل اسٹیجنگ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ تھیٹریکل اسٹیجنگ کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوشش کی جاتی ہے کہ سینری کے ذریعے ڈرامے کے عمل کو مناسب مقامات سے مختص کر دیا جائے ۔ لیکن سینری کے یہ مقامات عمل کے پس منظر ہی کے طور پر پیش ہوتے ہیں ، اس کے لیے ماحول مہیّا نہیں کرتے ۔ ایکٹر سین کے اندر کام کرنے کی بجائے اس کے سامنے کام کرتا ہے ۔ نیز تماشے کے دوران تماشائیوں کے سامنے سینری تبدیل کرکے عمل کو دوسرے مقامات میں منتقل کر دیا جاتا ہے ۔ تماشا یوں پیش کرنے کے لیے تھیٹریکل اسٹیجنگ کی اصطلاح اس لیے وضع ہوئی کہ اس میں سینری کی طرف توجہ یوں مبذول ہوتی رہتی ہے گویا وہ ایک تدبیر یا عذر کی حیثیت رکھتی ہے اور تماشائی کو برابر یہ خیال رہتا ہے کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے ، وہ تھیٹر کے اسٹیج پر ہو رہا ہے ۔

تماشے اس طرح پیش کرنے کا طریقہ سب سے پہلے اطالیہ میں احیائے علوم کے زمانے میں رائج ہوا ۔ مقبولیت نے مغرب کے دوسرے ممالک کو بھی ڈرامے اسی طور سے پیش کرنے پر مائل کر دیا ۔ چنانچہ تقریباً چار سو سال تک یہی طریقہ تھوڑی بہت ترمیم اور مختلف ناموں سے یورپ اور امریکہ میں رائج رہا ۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی جگہ اصلیت پسند تھیٹر نے لے لی ۔

---

۱ ۔ ان معلومات کے نوٹ میں نے شاید ۱۹۲۳ء میں سید علی اظہر مرحوم کے بیان میں سے لیے تھے ۔

اسٹیج پر سازو سامان کم استعمال میں لایا جاتا تھا ۔ دربار کے منظر میں سنہری سنگھاسن ، جس پر مخمل مڑھی جاتی تھی ، عموماً ایک اونچے چبوترے پر رکھا جاتا تھا ۔ اس کے سامنے پاؤں رکھنے کے لیے ایک پرتکلف اسٹول ہوتا ۔ عام مناظر میں ایک دو کرسیوں اور چھوٹی میز کے سوا اور کچھ نہ رکھا جاتا تھا ۔

بمبئی کے اردو تھیٹر کے اسٹیج کا یہ مختصر تذکرہ ایک بات کا ذکر کیے بغیر ختم کرنا مناسب نہ ہوگا ۔ بیان کیا جا چکا ہے کہ بمبئی کے پارسی پروڈیوسروں نے تماشائیوں میں ڈرامے سے زیادہ تحیّر افروز ڈراموں کا چسکا پیدا کر دیا تھا ۔ ستم یہ ہے کہ ڈرامے پر حال میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان سب میں تحیّر افروزی کی خصوصیت کو ڈراما پیش کرنے کا کمال قرار دیا گیا ہے ۔

نامی صاحب فرماتے ہیں :

"جہاں بخش" کی کامیابی کے بعد الفریڈ نے "گل رخسار" پیش کیا ۔ یہ بھی ایک طلسماتی ڈراما تھا اور اس کے مناظر بھی بڑی بڑی مشینوں کے ذریعے دکھائے جاتے تھے ۔ بعض مناظر بہت ہی ہولناک اور ہیبت ناک ہوتے تھے ؛ مثلاً ایک دیو کا برتن سے نکل کر فضا میں بلند ہونا اور گل رخسار کو گود میں لے کر غائب ہو جانا ، دیووں کا زمین میں دھنس جانا ، ایک زاہد پیر مرد کا پہاڑ پر نظر آنا ، پریوں کا ہوا میں اڑتے ہوئے غائب ہو جانا وغیرہ وغیرہ ۔ یہ ایسے پُر اسرار مناظر تھے کہ تماش بین محوِ حیرت دیکھتے ہی رہتے تھے اور پیشتر اس کے کہ وہ ایک لمحے کے لیے اس بات پر غور کریں کہ یہ کیا ہوگیا

---

۱ ۔ اردو تھیٹر ، حصہ اول ، صفحہ ۲۸۰ ۔

منظر نظروں سے اوجھل ہو جاتا اور ہزاروں تالیوں اور
"ونس مور" کے شور کے بعد بھی واپس نہ آتا ۔
"الفنسٹن ناٹک منڈلی نے ان طلسماتی ڈراموں کی کامیابی
دیکھ کر ۱۸۷۲ع میں علاؤالدین اور اس کا چراغ زبردست
تیاریوں کے بعد اسٹیج پر پیش کیا ۔ اس پر بے دریغ روپیہ
صرف کیا اور اسٹیج کو ایک کارخانے کی صورت میں تبدیل
کر دیا ۔ اندرونی اور بیرونی ٹرک سین (Trick Scene)
اس غضب کے بنوائے کہ علاؤ الدین اسٹیج ہوتے ہی
مقبول ہوگیا ۔"
محترمہ میمونہ بیگم تحریر فرماتی ہیں[1] :
"جب کوئی کمپنی طلسماتی یا الہامی یا ملکوتی ڈراما اسٹیج
کرتی تو سارا اسٹیج چھوٹا موٹا کارخانہ بن جاتا ۔ یہاں ہر
کام مشینوں کے ذریعے لیا جاتا تھا ۔ جیسے محل کا ہوا میں
اٹھنا ، پہاڑوں کا پھٹنا اور غائب ہونا ، دیووں کی فوج
کا آنا اور غائب ہو جانا ۔ جنگل میں آگ لگنا ، وغیرہ ۔
ہر کمالے را زوالے کے مصداق بمبئی کے اردو تھیٹروں کو
بھی زوال آ گیا ۔ بمبئی کی تھیٹریکل کمپنیوں اور اردو
ڈراموں کی بہار ختم ہو گئی ۔"
ان تدابیر نے تھیٹر کو منفعت بخش دھندا ضرور بنا دیا
لیکن ان سب چیزوں کا ڈرامے سے مطلق کوئی تعلق نہیں ۔
تھیٹر کا اسٹیج مداری کے کرتب دکھانے کو نہیں ہوتا ۔ اس
قسم کی تدابیر سے کام لینے کے لیے ڈرامے لکھوانا اور اسے اسٹیج
پر دکھانا ڈرامے کو اس کے وقار سے محروم کرنا ہے اور ڈرامے
کا کوئی بھی سنجیدہ و متین طالب علم ایسے قدر کی نظر سے

---

۱ ۔ از مقالہ محترمہ میمونہ بیگم ۔

نہیں دیکھ سکتا ۔

اسی طرح ناسی صاحب ریوالونگ اسٹیج سے بھی بہت مرعوب[1] معلوم ہوتے ہیں ۔ حالانکہ ڈرامے سے صحیح قسم کی دلچسپی رکھنے والا ہر شخص اسے ایک فضول اور بے مصرف چیز سمجھتا ہے ۔ اسے صرف وہ حضرات پسند کرتے ہیں جو تھیٹر کو کاروباری دھندے کے طور پر کرتے اور ریوالونگ اسٹیج پر حسین لڑکیوں کو بنا سنوار کر کھڑا کرتے اور اسٹیج کو گھما گھما کر لوگوں کو اُن کے جمال کا نظارہ کراتے ہیں ۔ ریوالوانگ اسٹیج سے زیادہ جو جو کام تھیٹر میں لیا گیا ، وہ صرف اتنا تھا کہ نصف ریوالونگ اسٹیج پر جب بڑا سین سامنے اسٹیج پر ہو رہا ہوتا تو اُس کے پچھلے نصف حصے پر دوسرا بڑا سین تیار کر لیا جاتا ۔ لیکن اس طرح دونوں بڑے مناظر کا طول و عرض اتنا کم رہ جاتا کہ اسے اس کام کے لیے بھی مناسب نہ سمجھا گیا اور اب یہ ایک متروک آلہ سمجھا جاتا ہے ۔

آخر میں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ بمبئی کے اردو تھیٹر کے حالات لکھنے میں اگرچہ اختصار سے کام لیا گیا ہے ، لیکن پوری کوشش کی گئی ہے کہ تسلسل برابر قائم رہے اور کوئی اہم بات لکھنے سے رہ نہ جائے ۔ امید ہے اس کے مطالعے سے ڈرامے سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو بمبئی کے اردو ڈرامے کی تاریخ اور اُن کے تماشوں کی نوعیت کا علم وضاحت سے ہوگیا ہوگا اور اردو ڈرامے کو بمبئی اور برعظیم میں مقبول بنانے کے لیے طرح طرح کی جو کوششیں پارسی مصنفوں ، ایکٹروں ، ڈائرکٹروں اور پروڈیوسروں نے سر انجام دیں ، اُن کی تفصیل

---

۱ - اردو تھیٹر ، جلد اول ، صفحہ ۲۰۳ -

سے واقف ہونے کے بعد اردو سے دلچسپی رکھنے والے حضرات ہمیشہ اُن کی خدمات کو احسان مندی سے یاد کیا کریں گے۔ بقول پنڈت راجندر ناتھ شدا بمبئی میں پوری طوالت کا پہلا اردو ڈراما "خورشید"[1] تھا۔ چنانچہ اردو ڈراموں کا یہ ترتیب وار انتخاب جو اردو کی تاریخ میں پہلی بار مرتب اور شائع ہو رہا ہے، اسی ڈرامے سے شروع کیا جاتا ہے۔

سید امتیاز علی تاج

۱۔ انڈین ڈراما، مطبوعہ انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا۔

سونے کے مول

کی

خورشید

سونے کے مول کی خورشید

جہانگیر رستم جی کھمباتا اپنی کتاب "میرے ناٹکی تجربات" میں "خورشید" کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:

"بمبئی میں ناٹک کا آغاز پارسیوں نے کیا تھا۔ ناٹکوں میں میوزیکل سنریوں کا رواج بھی پارسیوں نے ہی کیا تھا۔ بمبئی میں اور پورے ہندوستان میں اردو ناٹکوں کو پارسیوں نے ہی پھیلایا تھا، اردو ناٹک کا پہلا مصنف بھی پارسی ہی تھا۔

"سونا نا مولنی خورشید" ڈرامے میں جن جن نامور پارسی ایکٹروں نے حصہ لیا تھا، ان کے نام لکھنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ (معلوم ہونا چاہیے کہ) اردو ڈرامے میں سب سے اول کن ایکٹروں نے کام کیا اور ان میں سے کون کون ایکٹر (زیادہ) مشہور ہوئے۔

"اس کھیل میں مرکزی کردار فیروز شاہ کا تھا۔ (یہ کردار ایک صاحب مسٹر جہانگیر کو دیا گیا تھا مگر یہ پارٹ انھیں دینے میں) یہ الجھن پیدا ہوئی کہ جہانگیر گا نہیں سکتا تھا اور فیروز شاہ کے پارٹ میں گانے بھی تھے۔ دوسرے وہ اردو کھیل میں (چونکہ) پہلا تجربہ

۱۔ جہانگیر رستم جی کھمباتا نے اس کا موجد مسٹر ہیر جی بھائی اسپن دیار جی کھمباتا آنریری ڈائرکٹر الفریڈ ناٹک منڈلی کو قرار دیا ہے۔

تھا ، اسے زیادہ دلچسپ بنانے کے لیے اس میں گانوں کی بے حد ضرورت تھی ، اس لیے گانے والے ایکٹروں کو خاص طور پر آگے لایا گیا جس کے سبب سے فیروز شاہ کا پارٹ مرحوم مسٹر خورشید جی ، مہروان جی بالی والا باوابی کو دینے میں آیا اور فیروز کی معشوق خورشید کا پارٹ کلکتے والے مسٹر جمشید جی کے بھائی مسٹر ہستن جی فرام جی مادن کو دیا گیا ۔ دلّی کے بادشاہ فتح شاہ کا پارٹ مسٹر ہورم جی مودی (آنجہانی) نے لیا اور سندھ کے بادشاہ ملک شاہ کا (رو بیٹی نو کمپنی والے) مسٹر دارا شاہ سہراب جی تارا پور کو دیا گیا ۔ ظفر خان کوتوال کا پارٹ مسٹر دھنجی بھائی کبرا والا کو دیا گیا ۔ غازی خان کا پارٹ مسٹر دھنجی سوہولا کو دیا گیا اور فیض آباد کے بادشاہ کا پارٹ مسٹر کاؤس جی (آنجہانی) کے سپرد کیا گیا ۔ اِس طرح کئی تجربہ کار ایکٹروں نے پہلی مرتبہ اردو میں ناٹک کھیلا ۔ یہ گو کہ پہلا تجربہ تھا لیکن اس ناٹک سے مسٹر بالی والا نے شہرت کی انتہا پائی اور اپنا نام ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا ۔ یہ کیوں ؟ لیجیے غور سے سنیے :

"اگر مسٹر بالی والا نے فیروز کا پارٹ نہ کیا ہوتا تو شاید وہ اتنے مشہور نہ ہوتے ۔ چونکہ یہ پہلا اردو کھیل تھا اور اس میں مرکزی کردار (پیش کرنے) کا موقع انھیں ملا اور مسٹر بالی والا نے اس کے ساتھ ایسا انصاف کیا کہ آنجہانی اتنے مشہور ہوگئے ۔ دیکھنے میں مسٹر بالی والا بالکل ایک شہزادے معلوم ہوتے تھے ۔ اردو زبان ان کی مادری زبان نہ ہوتے ہوئے بھی انھوں

ے اس نے اچھا خاصا عبور حاصل کیا تھا۔ ان کا گلا
چونکہ بہت خوش آواز تھا۔ جس نے ان دو نبھانے میں
کافی مدد دی۔ مزید یہ کہ انہوں نے ایک چوٹی کے
ڈائریکٹر سے تعلیم حاصل کی تھی۔ "خورشید" کھیل میں
شہزادہ فیروز کی حیثیت سے میں نے انہیں دیکھا تھا اور
وہ اب تک مجھے برابر یاد ہیں۔ جس وقت وہ سٹیج پر
آئے تو تماشائیوں نے تالیوں کی گرج سے ان کا خیر
مقدم کیا تھا۔ یہ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ
جس کسی نے اس منظر کو دیکھا ہے، وہ اسے کبھی نہیں
بھول سکتا۔

"اس کھیل میں فتح شاہ بادشاہ، خورشید کو نیلام کرنے
کا حکم دیتا ہے کہ جو شخص ایک گز چوڑا، گہرا اور
لمبا کُنڈ (تالاب) بھر کر سونا دے گا، وہ خورشید کو
خرید سکتا ہے۔ خورشید کو بیچنے کا سین بھی امتیازی
تھا۔ نیلام کنندہ کا پارٹ آنجہانی مسٹر خورشید جی بالی
والا کے باپ آنجہانی مسٹر مہروان جی منچر جی بالی
والا نے ادا کیا تھا۔ آخری بولی پر فیروز سوداگر نے
خورشید کو خرید لیا۔ اس وقت لوگوں کو بڑی ہنسی
آئی اور ہم سب نے آنجہانی مسٹر مہروان جی کے
ساتھ مذاق کیا کہ باوا خسرو[1] کی دوسری شادی ہو گئی
کیونکہ اس وقت مسٹر بالی والا کی (پہلی) شادی ہو
چکی تھی۔ اور یہ منظر جس میں وہ اپنے سپوت بیٹے کو
ایک خوبصورت عورت بیچتے ہیں، محض ایک خواب تھا۔
اس غریب باپ نے اپنے بیٹے کو ایک ہمہ صفت موصوف

---

۱ ۔ باوا خسرو، بالی والا (صغیر) کا مخصوص نام ہوتا ۔

خوبصورت عورت سے بیاہ کر ایک سعادت مند شوہر ،
ایک شفیق باپ اور ایک معزز شہری کا اضافہ کر دیا
لیکن سٹیج اس قیمتی ہیرے سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا
اور صرف اس کا زندۂ جاوید نام باقی رہ گیا ۔

اردو ڈرامے کی جو خدمات پارسیوں نے انجام دیں ، ان سے
کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ، لیکن باوجود بہت زیادہ اور بہت
قیمتی معلومات حاصل ہونے کے ڈرامے کے متعلق مسٹر کھمباتا
زیادہ بالغ نظر معلوم نہیں ہوتے ۔ جس شخص کو ایک شادی شدہ
مرد کی شادی اسٹیج پر ہو جانا سرمایۂ مزاح معلوم ہو ، اس کی
رائے وزن سے محروم ہو جاتی ہے ۔

افسوس کہ "خورشید" کے مصنف ایڈل جی کھوری کے
حالات زندگی باوجود تلاش کے کہیں سے دستیاب نہیں ہوئے ۔
صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ یہ صاحب انگریزی کے تعلیم یافتہ
اور بیرسٹر تھے ۔ پہلے بمبئی کے ڈراموں میں شوقیہ کام کرنے
والے پارسی طلبہ کے لیے گجراتی زبان میں ڈرامے لکھتے رہے ،
پھر جب پیشہ ور تھیٹریکل کمپنیاں بن گئیں تو اُن کے لیے
گجراتی میں ڈرامے لکھے ، لیکن یہ معلوم نہیں ہونے پایا کہ یہ
اپنے اس دلچسپ شغل سے دل برداشتہ کب اور کیوں ہوئے ۔
ایک کتاب[1] سے صرف اتنا سراغ مل سکا کہ بمبئی سے یہ رنگون
چلے گئے تھے جہاں بحیثیت بیرسٹر کے نہ جانے کب تک
پریکٹس کی ۔ اس سے آگے صرف اتنا معلوم ہے کہ رنگون سے
انھوں نے مستقل طور پر لندن نقل مکان کر لیا ۔

ان بہت مختصر حالات سے اتنی بات بہر حال ظاہر ہے کہ

---

1. Shells from the sand of Bombay, by Sir D. B. Wacha, 1920.

انگریزی پر یہ اچھا خاصا عبور رکھتے ہوں گے ، اور چونکہ ڈرامے سے بحیثیت مصنف کے دلچسپی تھی ، اس لیے انھیں انگریزی کے کئی ڈرامے پڑھنے اور بھارت اور انگلستان کے اسٹیج پر دیکھنے کے مواقع بھی میسر آئے ہوں گے ۔ ان باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اگر خیال کیا جائے کہ دادا بھائی پٹیل نے اپنے ایک بہت اہم تجربے کے لیے ان سے ڈراما لکھنے کی فرمائش کی تھی ، تو اُس کی تعمیل میں داستانی انداز کا جو مبلو ڈراما اِنھوں نے تیار کیا ، اسے اولیت کے باعث خواہ کیسی ہی غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی ہو ، لیکن تعمیر کے اعتبار سے اسے قابل قدر قرار نہیں دیا جا سکتا ۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ڈراما دربار کے منظر اور فتح کی اطلاع پہنچنے سے شروع کرنا کیوں ضروری سمجھا گیا ؟ جنگ میں ایک شہزادی کی گرفتاری کی خبر سن کر دربار کے مسخرے کی معرفت ایک پرانی ماہ پیکر شہزادی خورشید کا ذکر چھڑنا اور معلوم ہونا کہ بادشاہ فتح شاہ نے اُس سے "بڑی عاجزی اور منت سے باقول و پیمان شادی کی تھی ، لیکن آج سات برس ہو گئے تب بھی" اسے کبھی دیکھا تک نہیں ، عجب منطق سے محروم گریز ہے ! پھر یہ بھی معلوم نہیں ہونے پاتا کہ سات سال کی طویل مدت کے دوران حرم کی چار دیواری میں بند ہوتے ہوئے شاہ کی منکوحہ سے کوتوالِ شہر کو عشق کب اور کن حالات میں ہوا اور عشق ہونے کے بعد کوتوال کو شاہی حرم میں بلا تکلف آنے جانے ، شاہ کی منکوحہ تک پہنچنے اور اس سے اظہار عشق کرنے کے مواقع کیوں اور کیسے حاصل ہوتے رہے ؟ پھر منکوحہ کی نافرمانی پر کوتوال کے مشورے سے طلاق دیے بغیر اپنی منکوحہ کو بازار میں

فروخت کرنے کی تجویز شاہ نے کیسے گوارا کر لی !

پھر کہانی کا ہیرو فیروز شاہ ، اودھ کے بادشاہ جہاندار شاہ کا فرزند اور فیض آباد کا ولی عہد ہے جو سوداگری کے سلسلے میں دہلی آ کر اس بازار میں پہنچتا ہے جہاں شاہِ دہلی فتح شاہ کے حکم سے خورشید فروخت کی جا رہی ہے ۔ وہاں فیروز شاہ کا ملازم بتاتا ہے کہ فیروز شاہ مال و اسباب کے سات جہاز بھر کے دہلی لایا ہے ۔ دہلی اور فیض آباد کے نام استعمال میں لا کر دہلی کو بندر گاہ ظاہر کرنا عجیب و غریب طفلانہ پن ہے ۔ اسی طرح عدالت کے منظر میں فیروز شاہ کا لباس موجود ہونے کی کوئی ممکن وجہ بھی بیان نہیں کی جا سکتی ۔ ڈرامے کے بیشتر واقعات میں اسی قسم کی بے سروپا باتیں نظر آتی ہیں جو نہ منطق کے اعتبار سے مناسب معلوم ہوتی ہیں اور نہ ان سے کوئی قابل قدر ڈرامائی نتائج پیدا ہوتے ہیں ؛ مثلاً ملک شاہ کا ایک عورت کے عشق میں ملک چھوڑ کر فقیر بن جانا ، ہمایوں شاہ کا شرف آباد سے دہلی آنے تک اتنا بدل جانا کہ اس کا حقیقی بھائی جہاندار شاہ بھی اسے پہچاننے سے قاصر رہتا ہے وغیرہ ۔ اکثر باتیں ایسی ہیں جن کی توقع ایک انگریزی سے واقف ڈراما نگار سے کسی طرح نہ ہو سکتی تھی ۔

معلوم ہوتا ہے مترجم نے کھیل میں خاصا تصرّف کیا ہے ، چنانچہ بمقابلہ مصنف کے وہ اپنے فرائض سے زیادہ بہتر طور پر عہدہ برآ ہوا ہے ۔ اس کا سراغ اس بات سے ملتا ہے کہ ڈرامے کی تعمیر اور تحریر میں نمایاں فرق نظر آتا ہے ؛ مثلاً مصنف نے کھیل کے پہلے منظر میں ، غالباً ظرافت کا اثر پیدا کرنے کے لیے لبھوا نامی ایک مسخرا رکھ دیا ہوگا لیکن مترجم نے اسے بولنے کے لیے ایسے جملے مہیا کیے جن میں برجستگی

کے ساتھ طنز بھی ملتا ہے ۔ اسی طرح عازی خاں مراحیہ کردار کو دہانت سے محروم ہے لیکن اس کی حرکات اسٹیج پر شاید تاثر پیدا کرنے میں ناکام نہ رہتی ہوں ۔

مرزبان جی کا اسلوبِ بیاں اس اعتبار سے بہت دلچسپ اور قابلِ غور معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان ان کے لیے اجنبی ہے اور وہ اردو زبان کے مراکز سے بہت دور رہے ۔ گھر میں یا گھر سے باہر مستند اردو کبھی ان کے کان میں نہ پڑ سکی ۔ اردو لکھنے کی قدرت انھیں جتنی اور جیسی بھی حاصل ہوئی ، تمام تر اردو کی تصانیف کے مطالعے سے ہوئی ۔ صرف اسی معلومات کی بنا پر مشکل صنف پر طبع آزمائی کرنا ، مختلف کرداروں کے لیے مناسب ڈرامے جیسی جملے مہیا کرنے کی کوشش عمل میں لانا اور عبارت میں جذبات کی حرارت پیدا کرنا ایک مبتدی کے لیے کچھ آسان نہ تھا ، چنانچہ اس سلسلے میں ان کی ہر شعورانہ کوشش داد کی مستحق معلوم ہوتی ہے ۔

مثلاً بادشاہ سے خطاب کے جملے مقفٰی ہیں :

"جہان جاہ و جلالی سے جھمکتی اور رعایا آبادانی سے دمکتی ہے ، سبھی جاگہ امن چین کی چھل اور روزی کی ریل ہے"۔ یا ". . . . نہیں کسی کو چین و قرار ، سبھی جا بُھک مروں کی پکار ۔"

بیانیہ نثر کو واضح اور دلنشین بنانے کے لیے تکلّف سے کام لینے سے احتراز کیا اور سیدھا سادا پن برتا گیا ہے :

"سچ ، لباس تو میرا فیروز کا ہے ۔ ایک بار پہن کے خورشید کے حضور میں جائے تو بے شک وہ اپنا خاوند سمجھے ۔"

بادشاہ ، بیگم ، غلام اور عام آدمی سے گفتگو کے اسلوب میں تنوع ہے ۔ خود کلامیوں کا اسلوب بھی ایسا مصنوعی نہیں جتنا اردو کے پہلے ڈرامے میں ہو سکتا تھا اور جیسا بعد کے کئی ناقص ڈراموں میں نظر آتا ہے ۔

مرزبان جی جذبات نگاری کی قدرت سے محروم نہیں ہیں ۔ جذباتی جملے ان کے ہاں خاص آہنگ رکھتے ہیں ۔ بلند بانگ لہجہ ، پُر شکوہ الفاظ ، چھوٹے مگر گہرے تاثر کے جملے :

خورشید : (کوتوال سے) اے بے ادب دیوانے ! ذرا زبان کو سنبھال ، فقط میرا نام ہی تیری تمام عزت اور زندگی دبانے کو بس ہے ۔ اگر کوئی رذیل ، خورشید پُر نور کے حضور پہنچنے کی ہمت کرے تو وہ اُس کے آتشِ تیز سے بُجھ جاوے ۔"

". . . جھوٹا ! جھوٹا ! دغا خور ، جھوٹا ! آگ ، پانی اور ہوا پر بسواس رکھنا . . . . . پر یہ پلید پہ مت رکھو . . . . "

(دایہ سے) خاوند کس کا اور محبوب کس کی ؟ سنگھار کاہے کا ؟ جاؤ اور اس سے جا کر صاف کہو کہ اب تیرے اور میرے درمیان کچھ علاقہ نہیں . . . ."

"بدی ؟ اب بدی میں باقی ہے کیا ؟ خرابی کی آخری نوبت تو میں یہ دیکھتی ہوں ۔ اب ہرگز میں اِس سے ڈرتی نہیں اور جب وہ کھوٹے گلاب کی باس لے لے کر نا امید ہوا ہے ، تب ابھی کھرے گلاب کی لمپٹ لینے کو آیا !"

خورشید : (فیروز سے) اے محبت پناہ فیروز شاہ ! ایسی زبان کہاں سے لاؤں کہ شکر تمھارے احسان کا ادا کروں ؟

بال بال میرا آپ کے لطف و کرم کا ثنا خواں ہے۔
آپ کی ابریشمی زلفوں کے تار تار سے میں صدقے ہوں
کہ آپ نے اِس بے قرار دل کو اس بے قدر اور
بے وفا فتح ساہ کے پنجے سے نجات دے کر دوبارہ
دوبارہ لباسِ انسانی پہنایا۔"

"اب تم کب پیچھا پھروگے؟ یار کے درشن دیدار کے
بغیر ایک پل مجھے ایک سال کے مانند دو بھر گزرے گی۔"
(خود سے) "ہمیشہ ہمیشہ تو (انگوٹھی) ان کی خوش نما
انگلیوں میں جگہ رکھنا، سدا تو میری محبت کا چراغ
اُن کے دل کے فانوس میں روشن رکھنا۔"

ایسے جملوں میں تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال کثرت
سے ہے جو مرزبان جی کے ہاں شاعرانہ نثر کی نشان دہی کرتا
ہے۔ تقریری اردو نہ جانتے ہوئے، اردو ڈرامے کی زبان کی بنیاد
یوں رکھنا کہ روزمرہ کا گجراتی اندازِ کلام اور محاورہ آئے بغیر
نہ رہا، پھر بھی ڈرامے کو اپنے تسلسل اور زور سے محروم نہ
کرنے پایا۔ ایسی زبان خواہ اردو کے ادب عالیہ میں شمار نہ ہو
لیکن فردون جی مرزبان جی کے فنکارانہ ذوق اور مخلصانہ صناعی
پر ضرور روشنی ڈالتی ہے۔

سید امتیاز علی تاج

سونے کے مول

کی

خورشید

ہندوستانی ناٹک

وکٹوریا ناٹک منڈلی کے لیے

گجراتی زبان میں

ایدل جی جمشید جی کھوری نے لکھا

اس کے بعد

ایک پارسی صاحب

(سیٹھ بہرام جی فردون جی مرزبان)

نے ہندوستانی زبان میں ترجمہ کیا

ہندوستانی زبان——رسم الخط گجراتی

بمبئی

طابع : آشکار چھاپ خانہ

ناشر : بہرام جی فردون جی کمپنی کورٹ بہرام جی ، ہورم جی سٹریٹ

٦ - ١١-١٨٧١ع

قیمت : ایک روپیہ

سونے کے مول کی خورشید

اس قصے خوانوں کی جناب میں یہ قلم حن (مصنف) اپنی طرف سے ظاہر کرتا ہے کہ اول اس کھیل کو ایک آسان زبان گجراتی میں تصنیف کیا تھا ۔ آسے اس کمترین نے تھوڑی آرائش اور تبدیلی کے ساتھ ہندوستانی زبان میں ترجمہ کیا ہے ۔ سبب اس کا یہ ہے کہ اس شہر میں ناٹک یعنی کھیل بازی کا شوق و خواہش روز بروز افزونی پکڑتا ہے اور ہر قسم کے سینکڑوں لوگ با شوق سے دیکھنے کو جمع ہوتے ہیں ۔ یہاں ہر طرح کی قومیں بستی ہیں مگر جو تماشا کیا جاتا ہے ، سو فقط پارسی ، گجراتی زبان میں ، تو یہ زبان اکثر انگریزوں مسلمانوں اور ہندوؤں کی سمجھ میں آنا مشکل ہے ، اس لیے کئی ایک صاحبوں نے خواہش اس امر کی کی کہ اگر کوئی کھیل ہندوستانی زبان میں لکھا جائے تو یہ یہاں کے باشندے ، قوم کو موافق آئے ۔ کیونکہ ہندی زبان سارے ہند میں مروج ہے ۔ یہ مصلحت بندے کو بھی پسند آئی ۔ اور یہ بوی تھا کہ زبان ہندوستانی میں آج تک کوئی کھیل یا ناٹک لکھا گیا دیکھنے میں نہیں آیا تھا ، بلکہ ہندوستانیوں میں اس کا وجود بھی نہیں ہے ۔ تو پھر اس کھیل کو اپنے حوصلے کے موافق سلیس اور روزمرہ کی ہندی زبان میں ، تاکہ وہ پارسی اور ہندوؤں کے لیے بھی آسان ہو اور سمجھ میں بھی آئے ، ترجمہ کیا ہے ۔ کیونکہ سخت فارسی ، عربی ، عبارت سمجھنا اکثروں کے لیے مشکل

ہے ۔ میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہندوستانی اس کمترین
کی زبان نہیں ہے بلکہ قاعدے وغیرہ کی بھی تعلیم نہیں لی ہے ۔
مگر محض دوستوں کی خوشنودی کے لیے اس کمترین نے موافق
طاقت اپنی کے زبانِ ہندی میں اس کی نقل کرنے کی کوشش
کی ہے ، تو عبارت ہندی میں اور قواعد میں خامی اور خطا رہی
ہوگی ۔ اور سبھوں کو آسان ہووے ، ویسی سلیس عبارت لکھنے
کے سبب سے عبارت بھی رنگین ، سنگین نہیں ہوئی ۔ بعد اس
خلاصے کے اس قصے کے سننے اور پڑھنے والوں کی ذات عالی سے
امید رکھتا ہوں کہ کوئی صاحب عبارت اور قاعدے کی ناواقفی کا
عیب گیر نہ ہو ، بلکہ اس سے در گزر کرے ۔ اس ناٹک میں
اکثر جگھوں پر اردو زبان میں مشہور قصوں ، جیسا کہ
مذہب عشق ، بدر منیر ، یوسف و زلیخا ، گل بہ صنوبر وغیرہ
میں سے موافق آئے ہوئے ، فقروں ، نکتوں اور اشاروں کی نقل
کی ہے اور اس سوائے تمام غزلوں اور گانے بھی استادوں کی
کتابوں میں سے انتخاب کر لیے ہیں ۔

———— —

افراد

فتح شاہ : دہلی کا بادشاہ ۔
ہمایوں شاہ : ایک بڑا بادشاہ اور جہاندار کا بھائی (والی شرف آباد) ۔
ملک شاہ : سندھ کا بادشاہ ۔
جہاندار شاہ : فیض آباد کا بادشاہ اور ہمایوں کا بھائی ۔
فیروز شاہ : ظاہر میں سوداگر مگر جہاندار کا بیٹا ۔
بہادر خاں : فیروز کا رفیق اور جہاندار کے وزیر کا بیٹا ۔
جہانگیر اور
جہاں بخش : دونوں ہمایوں شاہ کے بیٹے ۔
ظفر خاں : فتح شاہ کا کوتوال جو خورشید پر عاشق تھا ۔
غازی خاں : پیچھے سے بابک نام (ملک شاہ کے دربار کا مسخرا اور ایک بڑا چور) ۔
خورشید : فتح شاہ کی عورت اور ہمایوں کے ایک بھائی کی لڑکی ۔ بعد میں فیروز کی بیوی ہو گئی ۔
گل چہر : جہاندار شاہ کی بیٹی اور بہادر خاں کی معشوقہ ۔
مہتاب اور گلفام: جہاندار کی چھوٹی بیٹیاں ۔
مہر انگیز : داسی ۔
اس کے علاوہ دوسری داسیاں اور دایائیں ۔
افراد : لہنوا ، وزیر ، امیر اور تماش بین وغیرہ ۔
مقام : دہلی ۔ سندھ (شرف آباد) اور فیض آباد وغیرہ ۔

باب پہلا

پردہ پہلا

[دہلی میں ایک سنہری تخت کے اوپر دہلی کا بادشاہ فتح شاہ دل گیر دل سے رونق بخش ہوا ہے اور وزیر ، امیر ، ایلچی ، ندیم با ادب بیٹھے ہیں - چوبدار کھڑا ہو کر دعا گزاری کرتا ہے اور رامش گریں شاہ کی تعریف میں یہ گانا گاتی ہیں - بادشاہ کا خوش طبع مسخرا "لہتوا" زمین پر ہاتھی مار کے بیٹھا سر دھنتا ہے[۲]]

رامشگر : **گانا[۳]**

فتح شاہ کی فتح ہوئے گی ضرور

فکر خدا تیری بدا کرے گا[۴] ، من[۵] مت رہنا مغرور

—— فتح شاہ

جس کو ضلع[۶] دیوے خدا جہاں کا کیا دنیا کی مقدور[۷]

—— فتح شاہ

تقدیر دار[۸] دولہا نام ترا ہے ملک سارے میں مشہور

- - - فتح شاہ

---

۳ - کھیل کے کسی گانے میں راگ راگنی اور تال درج نہیں ہے ، ماسوا آخر کے ایک دو گانوں کے -

داتا دیدار تیرا بند دیکھتے ہیں[9] نین میں[10] برست اور

فتح شاہ ——

ہمت ہارے تیرا دشمن، ہوئے گا چار گھڑی میں چکچور[11]

فتح شاہ ——

فتح شاہ : واہ یہ کیسا معجزہ سرود[12] اور کیسا فرشتائی آواز[13] ؟
اے وزیر دل پذیر ! کیسی عجائبی کہ جب آج مجھے یہ[14] امیروں سے معمور دربار ، حوروں سے بھرا ہوا زنان خانہ ، جاودان تک زبان کو[15] لذت دینے والا نعمت کا شعر سونا[16] دیا ۔ اس چرب زبان لھتوے کا دل پسند سخن سبھی مانند زہر قاتل کے لگتے ہیں ۔ تب یہ شیریں حلق سے نکلتا ہوا آسانی سرود خوش حالی کے برسات[17] سے مجھے بھگا ڈالتا ہے ۔
کیوں دانشمندو ! یہی ہونے کا باعث کیا ہوگا ؟

وزیر : شہ[18] زمان فتح شاہ غازی ! اس میں عجائبی کچھ نہیں ، گانا بہ خود کلام الٰہی ہے ۔ فلک پر کا ملک بھی اس سے آزاد نہیں ۔ سرود ہر درد کی دوائی اور ہر مرض کی شفائی ہے ۔ سرود حیوانوں کو ہوش دیتا ہے ، پھر اہن تو انسان ہیں ، تو کیونکر اس سے غم و رنج دور نہ ہووے ؟

فتح شاہ : ہوشمند لھتوا ! تو بھی کچھ تاویل کر سکتا ہے ؟

لھتوا : البتہ خداوند ! آپ جو فرماتے ہو ، اس کا خلاصہ سن لو ۔ بندہ کہتا ہے ، جب حضرت آدم کے باغ میں ماما حوا پہلے (پہل) گانے کو بیٹھی ، تب باوا آدم پہلے سے سو گیا ۔ بڑے بڑے پہاڑوں زمین میں غرق ہوا ، ہولناک دریا خشک ہو گیا ۔ ندیوں میں

ربل آئی ۔ لہتوا کی دنیا بھی ہلی ہستی ہوئی ، فتح
شاہ کے درباریوں کے کان ایک دم بدھا کر انھوں
کو احمق بنا دیا اور خود فتح شاہ خوش حالی کے
خمار میں چکنا چور ہوگیا ۔ اے شاہ ! وں ہوے کا
باعث کیا ؟

فتح شاہ : (ہنس کر) یہ سب ادب لہتوا کوئی بڑا موذی ہے جو
کہ ضعیفی کے زمانے سے اب تک سور ہے ۔ اتنے میں
کتنی بک بک لگا رہا ہے ۔ تو پھر آخر میں شاید اس
کو دیوانگی در پیش آئے گی ۔ (کوتوال سے) اے
ظفر خان کوتوال ! آج ملک کی کیسی خبر ؟

کوتوال : جہاں پناہ ! آپ کے بخت کی یاری سے سب خیریت
ہے ۔ جہان ، جاہ و جلالی سے جھمکتی اور رعایا آبادانی
سے دمکتی ہے ۔ سبھی جا کہ امن چمن کی چھیل
اور روزی کی ریل ہے ۔ ظلم و زیادتی کا نام نہیں ،
چوروں کا تو ٹھام[۲۰] نہیں اور لشکر کا کچھ کام نہیں ۔
سب جا کہ کہاں پان[۲۱] اور آبادان ہے ۔

لہتوا : کیا پوچھتے ہو آبادان ؟ جا بہ جا دیکھیے تو سبد
سہوکان[۲۲] ۔ امن چمن کا نہیں آس ، سبھی جگہ ستیاناس ۔
گھاس بانس اتھ پنتھ[۲۳] ساری ، دانا دونی[۲۴] کی مارا ماری ۔
نہیں کسی کو چین و قرار ، سبھی جا بھک مروں
کا پکار ۔ خوشی کی تو بیٹھی ابھاگ[۲۵] ، نکلتے
گھروں سے مرثیے کا راگ[۲۶] ۔ روزی کی ریل تو ایسی
خوب ، بیوپار و بنج سب جاتا ڈوب ۔ چور کہاں سے
رہوے ادھر ، خود قاضی کوتوال پھاڑتا ہے گھر ۔
انصاف کی تو بلا ہی دور ، لانچ لونچ[۲۷] میں عدالت

چک چور۔ کوتوال واضی کی بھاری نظر، جو طرف دیکھتے ہیں خشےتر[۲۸]۔ شاہ کے زنانے میں پری پیکر نار، بن والی[۲۹] سے روتی زار بہ زار۔ خود شاہ کے محل میں ظلم کا پکار تو سارے شہر میں کہاں سے قرار؟

فتح شاہ : اے بے شرم لہتّوا! ذرا اختیار کے گھوڑے کی لگام تنگ رکھ ورنہ زمین پر پڑ رگڑ جائے گا۔

لہتّوا : بندے نواز! اگرچہ گدھوں پر عقل کا اسباب نہیں رکھوں اور انھوں کے لمبے کانوں میں اندازے کی کڑی نہ پہناؤں تو پھر ظلم کی پچھاڑی جھاڑنے میں کچھ عذر نہ رہوے گی۔

کوتوال : یہ کوئی بڑا ہی شیطان زادہ ہے۔

لہتّوا : سچ ہے دوست! مگر شیطان کے ساتھ گدھے ہم سری کرتے نہیں۔ کتابوں میں فرمایا ہے کہ ایک خدا کے ساتھ، دوسرا موت کے ساتھ، تیسرا شیطان کے ساتھ ہرگز برابری اور ٹھٹھا بازی نہیں کرنا۔ کیونکہ خداوند پاک کی کسی سے مسخری ہو سکتی نہیں۔ موت کی مسخری آدم‌زاد تو کہاں سے کرے، خود موت ہی آدم کی مسخری کرتا[۳۰] ہے اور شیطان تو ایسا گلے پڑو ہے کہ جو کوئی مقابل آوے تو اس کے ساتھ بات بھڑنے[۳۱] کو اور تعلیم دینے کو تیار ہووے۔ تو اے کوتوال! تیری عقل کی شکل پر حماقت کی ارینڈیا[۳۲] جو لپٹایا ہے اس پر میری ناقص صلاح کا چراغ سلگانے دیوے تو سب کچھ سفل[۳۳] ہو جائے گا۔

[ایک قاصد داخل ہوتا ہے]

قاصد : عالم پناہ شاہ ! آپ کے نام آور لشکر نے آپ کے غنیم افغانی کے والی اوپر بڑی فتح ملائی[۳۴] ہے - اپنے لشکر نے ہزاروں سپاہی مارے اور بہت سے سردار زمین دوز کیے - کئی جنگجو زنجیر میں جکڑے گئے اور آپ کے بہادروں ——

گانا

لڑے اس طرح سے وہ میداں میں
کہ بہنے لگا خوں بیاباں میں
زمیں خونِ دشمن سے کی لالہ زار
شمشیروں کا جھٹکا جوں سا ہو بہ نار[۳۵]
جہاں جس کی گردن پہ خنجر دھرا
وہاں خوں کا فوارہ اس سے بہا
لگایا جسے تیر خارا شگاف
ہوا پار سینے سے اس کے وہ صاف

یہی حالت دیکھ ، دشمن عاجز ہو کر بھاگا اور اپنی فتح ہوئی - غنیم کا بہت خزانہ ، لشکر اور افغان کے والی کی ایک حور پیکر بیٹی اپنے ہاتھ آئی -

فتح شاہ : شکر خدا ، واہ کیسی خوش خبر : گنج کے ساتھ خوب صورت شہزادی ہاتھ آئی - جلدی سے وہ نازنین کو یہاں لانا -

لہتوا : (دل میں) دیکھو ! دل میں یہ خفتہ[۳۶] سیر گوسفند کا سنتے ہی کیسا بھوکا ہوگیا ہے - فتح کی بات تو ایک بازو رہ گئی ، ذرا سا بھی تو اس کا اثر نہیں - زنان خانے میں شاہ کے نام کا جاری کرنے والا ایک

بے تقصیر جان باقی تھا ، سو پورا ہوا ۔

رامش گروں : **غزل**

شادیِ جلوۂ گل فام مبارک ہووے
عیش و عشرت کا سرانجام مبارک ہووے
تخت پر تم کو مبارک ہو جہاں میں پھرنا
غیر کو گردشِ ایام مبارک ہووے
سرو قمری کو مبارک ہو (تو) بلبل کو گل
آپ کو سروِ گل اندام مبارک ہووے

[اتنے میں وہ افغانی شہزادی داخل ہوتی ہے]

فتح شاہ : (شہزادی کو دیکھتے ہی متعجب ہوکر) واہ ! کیسی نیک نما نمودار یہ ناری ہے ۔

وزیر : خوب صورتی کی خوش حالی میں کیسی خماردار ہے ۔

لہتوا : بس سب میں بد دیانت ، تو بڑی بدکار ہے ۔

شہزادی: (دھتکار سے[۳۷]) گل چھری کے گچھے کے پاس دھندیلا[۳۸] بھنورا گنوار ہے ۔

لہتوا : (اپنے دل میں) اچھا ٹونا[۳۹] لگایا ۔ جو سمجھے اسی کی موت ، نہ سمجھے اسی کی کم بختی ۔

فتح شاہ : خواص ! یہ نازنین کو لے جا کے شتاب اپنے خاص حرم خانے میں جگہ دے ——— (لے جاتی ہے) ۔

لہتوا : (اپنے دل میں) آج کم بخت شاہ نے بدل کر نئی جوتی پاؤں میں ڈالی ۔ اچھا اسی کو حرم میں جگہ دینا کہ خوب صورتی کا لٹارا[۴۰] اس کا پاکیزہ گوہر لوٹ لے کر خوش حال بیٹھے ۔ (بلند آواز سے) بندے نواز !

بندے کی جان بخشی ہووے تو بہتر سخن بیان کرنے
کی امید رکھتا ہوں -

فتح شاہ : اے لہتوا ! کچھ ڈر نہ (رکھ) جو بہتر ہو سو کہہ دے -

لہتوا : خداوند ! آپ کو کچھ خبر ہے د. ماہ پیکر شہزادیاں
زنان خانے میں آپ کے نام سے روتی ہیں - سب
ستاروں کی سردار ، نیک کردار جو ہمایوں شاہ کی
بھتیجی خورشید ، اسی کے ساتھ آپ نے بڑی عاجزی
اور منت سے با قول و پیماں شادی کی تھی ، لیکن
آج سات برس ہو گئے تب بھی آپ نے ان کو پھر
دیکھی نہیں ہے - یہ کیسا ظلم ، یہ کیسی بے مروتی ،
یہ کیسی ایمان داری اور کیسی چشم چرائی ؟

[اُٹھ کے چلا جاتا ہے]

فتح شاہ : (سر دُھن کر) سچ سچ بڑی غفلت ہوئی - ایک
جواہر بے بہا کو میں نے آج سات برس ہوا غفلت سے
ڈال رکھا ہے - بے شک وہ خورشید ماہ پارہ ہے -
اس کے مقابلے میں کوئی نازنین اب تک میں نے
دیکھی نہیں ہے - ایک دفعہ وہ جان سے بھی عزیز
تھی - میں ایک کھرے جواہر کو چھوڑ کر فقط بلور
کے ٹکڑوں پر راضی رہا - یہ میری قصور ہوئی ہے -
چوب دار! تو زنان خانے کی دایا کو لے کر شتاب
اس ماہ پیکر خورشید بیگم کے پاس جا اور ان کو
فرما کہ آج بن ٹھن کے محل میں رونق بخش ہووے -
میں بھی اس کی ملاقات کو تیار ہوں -

[بادشاہ ، وزیر اور سب مجلس اُٹھ کے چلا جاتا ہے]

کوتوال : (اکیلا) اے جان کو زحمت دینی والی خورشید !
تو مجھ سے ایک حشمت دار کوتوال کو اپنی محبت
کے دیوان خانے میں کس لیے راہ نہیں دیتی ؟ جو
بے مہر شاہ تجھ سے بے درکار[۴۱] ہے ، اس کی گلی میں
عبث دوڑتی ہے اور میں جو کھرا طالب کار ہوں ،
تو میرا کچھ بھی تیرے اوپر اثر نہیں ۔ تیری خاطر
میں نے شاہ کے دو نوجوان سرداروں جہاں بخش اور
جہانگیر کو دیس نکال کروایا ، کیوں کہ انھوں نے
میرے عشق کی راہ میں پتھر ڈالنے والے تھے ۔
تیرے کارن اپنے گھر بار اور شاہ کے دربار میں گاہ
بہ گاہ بے حرمت ہوتا ہوں ۔ لیکن تو خوش بودار
گل ! میں غریب بلبل کو اپنا سُگندھ دیتا نہیں ۔ اے
جان بخش ! اس ناصبور دل کا لہو جم گیا ہے ، سو
ایک شیریں بوسے کی گرمی سے ذرا تو پگھلا ۔
میرے بدن کے تمامساندھے[۴۲] بڑھاپے سے اکڑ گیا
ہے ، وہ تیری خوش بغل گیری سے چھڑا ۔ پیاری !
کب تلک اتنی ہٹ لیے بیٹھے گی ؟ اے خورشید !
تو اپنی تیز کرنوں میرے رخساروں پر ڈالتا رہے گا
تو خوب ہے ورنہ میں تجھے بلندی کے تخت سے
اتار کر بے حرمت کروں گا ، اور میرے ہوس کے شنجے
میں پھنسا کر با زور و ظلم تجھے قید کروں گا ۔

[جاتا ہے]

باب پہلا

پردہ دوسرا

دہلی میں بادشاہی دیوان خانہ

[خورشید اور مہر انگیز بیٹھی ہیں اور (خورشید) غصے میں بھری ہے]

مہرانگیز: اے خوب نما خورشید! خلقِ خدا کا یہ شاہی رواج ہے، تجھے کون سی چیز ضرور[1] ہے؟ خدا کی مہربانی سے بادشاہی مہمان خانے میں تا امن و چمن آرام کرتی ہے۔ زریں لباس کے دبدبے سے تیرا خورشیدی نیز[2] جا بہ جا روشن ہوتا ہے اور دنیا کی سب نعمتیں نزدیک تیرے موجود ہیں۔ مانند میرے کئی داسیوں تیرے حضور ہاتھ باندھ کر کھڑی رہتی ہیں۔ اب کس لیے اتنی شور بکور[3] کرتی ہے۔

خورشید: مہر انگیز! تیرے میں دانش کا گوہر کوتاہ ہے۔ کیا میں ایسی دور دھاؤں[4] پر للچا کر آئی ہوں۔ کیا میں نے فقط اتنی جاہ و جلالی کے واسطے تیرے بے ایمان شاہ کے ساتھ شادی کی تھی؟ کیا ایک پتھر کی مورت کے مانند پرستش کرانے کو آئی ہوں؟ میرے لاہور پدر کے محل میں مجھے کون سی چیز کی کوتاہی ہوتی؟ ہزاروں شہزادے میرے پیچھے

دیوانوں کی مانند پھرتے تھے ۔ ان کی کچھ بھی داد نہیں لگی۔ اور کم بختی میری اور بزرگ چچا ہمایوں کی کہ اس نے بے وفا ، بے قدر اور بے مروت فتح شاہ پر لبھا کر اپنے دولت خانے کا ایک نادر گوہر بیچا ۔ اے مہر انگیز ! ایسا ہونے سے آج وہ چچا بہت غم خوار[6] ہے ۔

مہرانگیز : نورمند خورشید ! خداوند پاک چند روز میں سبھی فضل و قرار کرے گا ۔ صبر بڑی ضروری ہے ۔ گھڑی بھر سوچ کہ دنیا کی تمام چیزوں کا مزہ لیا ، فقط ایک نہیں تو کیا مضائقہ ؟

خورشید : اے بے عقل ! وہ ایک ہی چیز پر میرے طالع کی تلوار لٹک رہی ہے ۔ جب وہ زیر زمین ہوئی کہ زندگی کا تار ٹوٹے گا ۔ عورت کا پاک خوراک اس سوائے کچھ نہیں ۔ آدم کی حیات کی آس اور دکھ کا ناس وہی ہے ۔ یہ گلابی رخساروں کا کیا کام ؟ یہ بہار کا باد سے کھیل کر خود بہ خود پژمردہ ہونا نہ چاہیے ۔ پر لائق باغبان کے اس کا سواس[7] لینے کے بعد کمھلانا چاہیے ۔ یہ تیر نگاہ سے غیروں کا سینہ چبھنا نہ چاہیے بلکہ اس دل فگار تیر اپنے لائق بھانترے[8] میں رہنا خوب ہے ۔ یہ چمک دار پیشانی کی روشنی وہ گمراہ لمپٹ[9] باز کے لیے نہیں بلکہ عاشق حق دار کی ہنسی مارتی پیشانی کی جھلکاہٹ زیادہ کرنے کے لیے ہے ۔ اے مہر انگیز ! جب بادشاہ بے قدر ہوا ہے ، تب ان کا لچ اور چنڈال کوتوال مجھ پر کیسی بے ادبی اور ظلم گزاری کرتا ہے ۔ وہ تو اپنی نظر سے

دیکھتی نہیں ؟

[خود کوتوال دیوان خانے کے باہر خورشید کی تعریف
میں ایک گانا گاتا ہے اور خورشید سحر انگیز کے ساتھ
عجائب سے سنتی ہے]

کوتوال : گانا

اگر یوں ہی دل کو ستاتی رہے گی
تو اک دن مری جان جاتی رہے گی
—— اگر

میں جاتا ہوں دل کو ترے پاس چھوڑے
مری یاد تجھ کو دلاتی رہے گی
—— اگر

اگر تجھ کو چلنا ہے چل ساتھ میرے
یہ کب تک تو باتاں بناتی رہے گی
—— اگر

خورشید : یہ کون مرد ہے اور کیا آرزو رکھتا ہے ؟

کوتوال : (باہر سے) خورشید کی پرستش کرنے والا ہے اور اس
کی زرافشاں کرن کا آرزومند ہے ۔

[سحر انگیز وہاں سے نکل جاتی ہے]

خورشید : توبہ خدا ! پھر وہ لعنتی کوتوال ! جوش مند جی
اکلانے کو آیا ہے ۔

کوتوال : (داخل ہوکر) مبارک خورشید ! آپ کا حال احوال تو
خوش ہے ؟

خورشید : خوشی نا خوشی کی تجھے کیا درکار ؟

کوتوال : جب جاں تجھ پر قربان تب میری جان ! تیری درکار نہیں ؟ خدا شاہد ، بس تجھے جگر سے چاہتا ہوں ۔

خورشید : چاہتا ہے ؟ کس کو چاہتا ہے ؟ اپنی جورو کو چاہ ، اپنے فرزند کو چاہ ، اپنی عزت کو چاہ ! !

کوتوال : تو ہی جورو اور تو ہی زندگی ، خورشید بغیر روشنی کہاں ہے ؟

خورشید : اے بے ادب دیوانے ! ذرا زبان کو سنبھال ۔ فقط میرا نام ہی تیری تمام عزت اور زندگی دبانے کو بس ہے ۔ اگر کوئی رذیل خورشید پرنور کے حضور پہنچنے کی ہمت کرے تو وہ اس کے آتش تیز سے بجھ جاوے ۔ کبھی غلیظ بھنورا مد پورے پاس جانے کا ارادہ کرے تو خفا ہوئی مکھی اپنے ڈنک سے اس کو مار ڈالے گی ۔ تو پھر خدا یہاں سے جا !

کوتوال : اے جان و دل کو آرام بخشنے والی ! مجھ بے قرار سے دریافت فرما ، میں نے تیرے لیے بہت سی محنت و سرگردانی اٹھائی ہے ۔

خورشید : جا ! اے ناپاک چشم ! بس یہاں سے جا ! تیرا خانہ خراب ہووے جا !

کوتوال : اے نادان نازنین ! شاہ نے تو تجھے مانند کچرے کے ڈال رکھا ہے اور تیرے حضور جاہ و جلال سے پُر مجھ سا ایک امیر اتنی منت اور عاجزی کرتا ہے ، تو بھی تو کچھ نہیں سنتی ؟ اے بے قدر ! تجھے میرے درجے ، میری حشمت ، میری دولت اور مشہور نام پہ باشوق سے طمع کرنا چاہیے ۔

خورشید : اے دوزخی مرد ! اگر تو آسمان کی بادشاہی رکھتا ،

اگر وہ سے زمین کا بادشاہ ہوتا یا حوروں کا شہنشاہ تو
بھی میں تجھے اپنی حوتی کی نگہ داری کے لیے بھی
رکھتی نہیں ۔ لعنت اسے بے نباد تیری زندگی پر !
جس کا نمک کھاتا ہے اسی کا ہی نمک داں توڑنے کا
ارادہ رکھتا ہے ۔

کوتوال : اے تند مزاج عورت ! اتنی تندی سے باز رہ ۔ یہ تیری
ہٹ اور حجت کو با زور تابع کروں گا ۔

خورشید : (غصے سے) زور سے تابع کرے گا ؟ اے سوذی غلام !
تیرا کیا مقدور کہ مجھے ایک انگلی بھی لگاوے ۔ اے
بدکار دیو ! اپنی انکھیاں پھوڑ کر دیکھ کہ تیرے
پلید ہستی سے یہ دیوان خانے کی معطر ہوا بھی
غلیظ ہو گئی ہے ۔ اب اِدھر سے منہ کالا کر ، نہیں تو
ابھی تجھے پاپ کے پچھتاوے کی خاطر دوزخ کے غار
میں بھیجوں گی اور تیرا بد نام و نشان دنیا سے نابود
کروں گی ۔

[کوتوال جھڑپ[۱۳] سے بڑھ[۱۴] کر خورشید کو پکڑنا چاہتا
ہے ، خورشید پکارتی ہے ۔ اتنے میں مہر انگیز اور حرم خانے کی
رکھوالی دایا اور دوسرے آ پہنچتے ہیں]

دایا : مہربان خورشید ! یہ کیا ہے ؟ کس لیے اتنا شور و
گھبراہٹ دکھاتی ہے ؟ یہ کوتوال صاحب یہاں
کاہے کو ؟

کوتوال : اے دانش مند دایا ! کچھ یہ ہٹیل کو سمجھا ، میں
شاہ کے فرمان سے ان کو بلوانے آیا ہوں اور یہ شاہ
کی نافرمانی کر کے ناحق مجھ سے خفا ہوتی ہیں ۔

خورشید : جھوٹا ! جھوٹا ! دغا خور ! جھوٹا ! آگ، پانی اور ہوا پر بسواس رکھنا ، جنگلی شیر و پلنگ پر بھروسہ رکھنا ، پر یہ پلید پہ مت رکھو ۔

[خنجر نکال کر اپنے دل میں مارنے کا قصد کرتی ہے]

یہاں سے اس دیو کو نکالو ، نہیں تو ابھی جی نکال ڈالتی ہوں ۔ اس موذی سے میرا دامنِ پاک لرزتی ہے ۔

دایا : کوتوال صاحب ! تم یہاں سے شتاب جاؤ ۔

کوتوال : کچھ میری بھی سنو تو سہی ۔

خورشید : بس ، نہیں ، اس پلید کا ہر ایک سخن ہزاروں پاک ذات کی خوب صورتی ڈُبا دے ، ایسا ہے ۔ بس ان کو یہاں سے نکالو ۔

[سب مل کر وہاں سے کوتوال کو باہر نکالتے ہیں]

دایا : (خنجر چھین کر) اے مہر و ماہ ! آج یہ کیا حقیقت ! جی کو رنجیدہ مت رکھ ۔ اب شتاب کر ، میں تیرے واسطے ایک خوش خبری لائی ہوں ۔ چل ! ابھی سولہ سنگھار کرکے بن ٹھن ۔ آج تیری خاوند نام دار فتح شاہ نے تجھے یاد کیا ہے ۔ وہ تجھے باعزت بلاتا ہے اور آج تو اپنے محبوب سے آرام چاہتا ہے ۔

خورشید : (جوش میں) خاوند کس کا اور محبوب کس کی ؟ سنگھار کاہے کا ؟ جاؤ ! اور اُس سے جا کر صاف کہو کہ اب تیرے اور میرے درمیان کچھ علاقہ نہیں ۔ میں پہلے ہی تیرے ساتھ شادی کرنے کو راضی نہیں تھی کیونکہ تیری بدچال اور بے مروتی جگ میں مشہور تھی لیکن تو نے مجھے قول و بچن دیا تھا کہ میں اب

سے غیروں کی محبت نہ کروں گا اور فقط تجھ پر راضی رہوں گا ، مگر اس پیمان کے بدلے آج سات برس کی درازی ہوئی ، مجھے دور کیا ہے ، پھر وہ پیمان کہاں رہا ؟ اب مجھے تیرے ساتھ کیا سبب ؟ اب میں تیری محبوب نہیں لیکن (مجھے) بہن و بیٹی برابر جان - وہ گمراہ کو کہو کہ اب میں تجھے مانند پدر کے گنتی ہوں - پھر یہ بات کبھی ہونے کی نہیں - میں نے سب محبت کو جلا ڈالی ہے -

دایا : اے شہزادی ! یہ کیا بولتی ہے ؟ شاید تو کم فہم اور دنیا کے ناموس سے محروم ہے - لازم ہے کہ اس خیالِ محال سے باز رہ اور آتی بدی سے ڈر -

خورشید : بدی ! اب بدی میں باقی ہے کیا ؟ خرابی کی آخری نوبت تو میں یہ دیکھتی ہوں ، اب ہرگز میں اس سے ڈرتی نہیں ، اور جب وہ کھوٹے گلاب کی باس لے لے کر نا امید ہوا ہے ، تب ابھی کھرے گلاب کی لپٹ لینے کو آیا -

دایا : جان من خورشید ! کیا بات ؟ تجھے لازم ہے کہ اس اندیشۂ باطل سے گزرے اور لڑکوں کی طرح ہٹ نہ کرے - بادشاہ کا مزاج بہت سا خراب اور غصہ دار ہے ، وہ شاید تیری جان کو جلل[۱۶] پہنچائے گا -

خورشید : مزاج خراب ہے تو اپنی تو بھاری - کیا مقدور کہ میری جان کو وہ ایذا دیوے - میرا ضعیف چچا ، اس کا دندان توڑ ڈالے گا - میرے مرنے کے بعد روح کا مرغ دنیا میں جا بہ جا اس کی فضیحتی کرے گا - اب جاؤ اور تم یہ سب بیان اس سے کہو اور پھر

بھی دیکھو کہ اب بازی ہاتھ سے گئی - آج میں اس کی
بجائے بیٹی ہوں اور کوئی اپنی بیٹی پر معشوق کا
دعویٰ نہیں کرے -

[سب کوئی دل گیر ہو کر جاتے ہیں]

(خورشید اکیلی) اے دنیا ! سب کوئی یہ کانچ کے
مانند جلا دینے والا بدن پر لبھاتا ہے - مگر کس کو
خبر کہ اس پر ظلمات سے کیسی درگت پڑی ہے -

[خورشید جاتی ہے]

باب پہلا

پردہ تیسرا

محل کا ایک دالان

[فتح شاہ ، وزیر ، کوتوال ، لہتوا اور دو عورتیں موجود]

فتح شاہ : (غصے میں) کیا میری طرف اتنی نافرمانی ؟ حجت اور مجھے ڈرانا ؟ ایک نا چیز سی عورت ، شاہ عالم کی حرمت کو اٹھانا جانتی ہے ؟ کسی کے اوپر اتنی مشتاق ہے ؟ اس نے میرے ایک دو اور تین حکموں کو نندی سے رد کیا ۔ اے وزیر! ابھی کے ابھی اس نافرمان کو سولی پر چڑھادے ۔

وزیر : جہاں پناہ ! سچ ہے کہ اپنی عادل اور پاک سریعت میں تو ایسی نافرمانی کی سزا موت ہے لیکن یہ بدبخت مصیروار ایک شہزادی اور نازک عورت ہے ۔ اس لیے لائق ہے کہ ان کو کوئی کم تر سزا دی جائے ۔

شاہ : نہیں نہیں ، کبھی کم تر نہیں کروں ، میں اس کا جی لوں گا ، ذبح کروں گا ، مار ڈالوں گا ۔ اے چالاک لہتوا! تو کیا سوچتا ہے ؟

لہتوا : بندہ نواز ! میں سوچتا ہوں کہ خورشید کے مغز میں کچھ خلل ہوا ہے بلکہ دیوانی ہوئی ہے ، پر دیوانے کے سخن پر کچھ اندیشہ نہیں لے جانا ۔

فتح شاہ : وہ سب کو دیوانا بنائے ، ایسی ہے ۔ کون اس کو دیوانی کہے ؟ جو سخن اس نے بھیجے ہیں ۔ اس سے دیوانے کی باس نہیں معلوم ہوتی ۔ اب ہو سو ہو مگر اس کو جیتا نہیں رکھنا ۔

لہتوا : غریب پرور ! آپ کا ارادہ بن دریافت ہے ۔ خورشید کو مارنا دشوار ہے ۔ جو جان کو اس کی کچھ بھی اذیت کیا تو عالم میں دشواری اور شرم ساری حاصل ہوگی اور اس کا چچا ، جو بڑا زبردست ہے ، اس کے ساتھ صلح میں خلل پڑے گا ۔ مبادا جنگ عظیم درپیش آئے ۔

فتح شاہ : ہونے کا ہو ، سو ہونے دو ، پر میں ہٹ نہیں چھوڑوں ۔ لوں میں اس رانڈ کا جان ، تبھی میں کھرا فتح خان ۔ آج یہ نافرمان ہوئی تو کل سارے زنان خانے کا یہی حال ۔ آج عورت ہٹیلی ہوئی تو کل سارا دربار ، کچھ بھی تو سزا چاہیے ۔

لہتوا : ہاں ، سزا تو چاہیے ۔

فتح شاہ : تب کیا یہ اس بے ادب کو اچھی طرح سے کوٹنا ؟

لہتوا : درست ہے خاوند ! بانس کو کنشولے[۲] سے موڑنا بھلا ، جب پختہ ہوا تو بڑی سختی ۔

وزیر : افسوس بڑا ہے کہ نازک خورشید اتنی ہٹیلی ہے ۔

لہتوا : اس میں عجائبی کیا ؟ گلاب خوشبودار و خوش نما ہے لیکن کانٹا رکھتا ہے ، سرپ[۳] سہاونا ہے لیکن زہر رکھتا ہے ، گدھا بڑا سنتوشی[۴] اور باربردار ہے لیکن پچھاڑی جھاڑتا ، بکری شیریں سا دودھ دیتی ہے لیکن لینڈ بھی ڈالتی ۔ کوتوال اور قاضی سبھوں کی

چوری پکڑتے لیکن خود عورتوں کی چوری کرتا ہے۔ بادشاہ بڑے جنگ باز کہلاتا لیکن زبان خامہ ان کا میدان ہے

فتح شاہ: اے لہتوا! اتنی بیری فیلسوفی چھوڑ اور یہ درد کا درمان بتا۔ وہ بد ذات خورشید کی گردن مارنے سے روکتا ہے تو پھر کیا علاج؟ (کوتوال سے) بہادر کوتوال! تو کیا مصلحت دیکھتا ہے؟

کوتوال: (دل میں) کوئی تدبیر ایسی کرنا چاہیے کہ یہ رانڈ میرے ہاتھ آئے اور شاہ بھی راضی رہے۔ (ظاہر میں شاہ کو) عجب پناہ! ایک مصلحت اچھی نظر آتی ہے کہ خورشید بیگم کو کوئی ایذا دینا تو خوب نہیں لیکن اس کو ظاہر بازار میں بیچ ڈالنا۔ جو کوئی ایک گز اونچا اور ایک گز چوڑا تھیلا سونے سے بھرپور کر دیوے، اسی کو یہ بیگم دینا۔ اے شاہ! ایک گز سونا دیوے ایسا دنیا میں کون ہے؟ کوئی اتنا دے گا بھی نہیں اور خورشید کو لے گا بھی نہیں۔ بیگم تو اپنے ہی پاس رہے گی، فقط خورشید کی سارے جہان میں فضیحتی ہوگی اور وہ اپنی غروری چھوڑے گی۔ اگرچہ کسی نے خرید بھی لی تو خزانے میں بہت سی افزونی ہوگی۔ یہ ہٹیلی اور نافرمان عورت لائقِ بادشاہ نہیں ہے۔

فتح شاہ: شاباش کوتوال! یہ بڑی دانائی کی بات۔ لاکھوں ٹکے کی قیمت اس تیری صلاح کی ہے (وزیر سے) نام دار وزیر! اٹھ، کر ابھی کا ابھی حکم کہ یہ غرور رانڈی کو بھر بازار میں بیچنے کو رکھے۔

[وزیر جاتا ہے]

کوتوال : (اپنے دل میں) سبحان اللہ ! معشوق ہاتھ لانے کی اچھی باری ہاتھ آئی ۔ اب ظاہر بازار سے اس ہتھیلی کو میں ہی لوں اور لے کر کوئی دوسرے شہر نکل جاؤں کہ پھر شاہ کا دست رس میرے پر نہ رہے ۔

لہٹوا : (دل میں) کہتے ہیں کہ ڈھیڑے ڈھکھورے^8 سے راسی تو وہ بات سچی ہے ۔

باب پہلا

پردہ چوتھا

دہلی شہر کا بازار

[لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ خورشید بیگم کو پردہ پوش، ایک کرسی اوپر بٹھایا ہے۔ سب درباری اور کوتوال نزدیک کھڑے ہیں۔ ایک شخص ڈنکا پیٹ کر پکارتا ہے]

دالڈیا : سب خوبصورتی کے خریداروں کو، مہتاب سی محبوبوں کے عاشقوں کو، نقد مال پہچاننے والے ہوس مندوں کو، بادشاہی خاتون کے طلب گاروں کو، اور تمام شہزادوں، امیر امراؤں، ادنیٰ و اعلاؤں، زر دار، مال دار و تجار سبھوں کو با تکرار ظاہر و ماہر کیا جاتا ہے کہ عالی جاہ، عزت پناہ، شاہ جہاں بادشاہ، فتح خان نے اپنی خوش چہرہ خورشید بیگم سے ناخوش ہونے کے باعث آج سب کے حضور اس بیگم کو بہ مول ایک کنچن سونے کے بیچ ڈالنے کا فرمان دیا ہے۔ جو کسی کی تاب و طاقت ہو تو اس کو خرید کر لینا۔

[ایک نوجوان سوداگر نزدیک آتا ہے]

سوداگر : ذرا بتا تو سہی ! ایسی کیسی نازنین ہے کہ کنچن کے مول سے بیچی جاتی ؟

ڈانڈیا : جی ، دیکھنے کا دام پڑتا ہے ۔ آپ نے عمر بھر میں ایسی خوبصورتی نہیں دیکھی ہوگی ۔ یہ ایسی ہے پری پیکر نار جن کی پیشانی پر ماہ کے آثار ۔ جس کی چشموں کی نرگس میں دو ہیرے جڑے ، جو ادم کے اندھیرے جگر کو روشن کرے ۔ رخسار دیکھو تو مخمل کے دو دڑے[1] ، لب ہیں بدخشان کے لال سے جڑے ۔ ہاتھوں سنگ مرمر کی صفائی سے بہار ، مشکی بال روپہلی گردن پہ جھمک دار ۔ خلق خدا میں نہیں اس کا جوڑا ہوئی ؛ جس نے دیکھی یہ محبوب ، اس نے عقل نہ ہوئی ۔

سوداگر : خالی ڈفانس[2] چھوڑ دے اور ذرا سا منہ تو بتا ! دیکھے بغیر کیسے خریدی جائے ؟

[پردہ اٹھا کے خورشید کو دکھلاتا ہے ۔ اسے دیکھتے ہی غصے سے خورشید اپنا منہ پھرا ڈالتی ہے]

سوداگر : ہے مال تر ، قیمت دار ہے (تعجب ہوتا ہے) ۔

ڈالڈیا : ہاں مال قیمت دار ہے ، لیکن مول دیا جائے گا مول ۔

سوداگر : ارے ایک کیا پر سارا زنان خانہ خریدنے کی طاقت رکھتا ہوں ۔

ڈالڈیا : چلو تب ایک گز اونڈا ایک گز چوڑا ، ایک کنڈ سونے سے بھر دو ۔

سوداگر : ایک گز کا کنڈ سونے سے ؟ یہ کیا بکتا ہے ؟

ڈھنڈورچی : بس ، چھتیا دب گئی ! اپنے والے کا منہ تو دیکھو ۔

کوئی دن لائی تھی ، لائی تو نہیں ، پر دیکھی بڑی ،
دیکھی نہیں تو سنی بھی تھی ۔ جاؤ جاؤ میاں ! تمھارا
کام نہیں ، رنڈی لینے کو آئے ؟

[سوداگر کُپ چُپ چڑھ جاتا اور دوسرے ایسا بھی
بول سن کے منہ دھن ، پیچھے سے ہیں]

ڈالڈیا : آجانا ! آجانا ! کنچن کے مول سے شہزادی خورشید
لینا ہو تو آجاؤ ۔

[ایک بدصورت ، ضعیف اور لاغر امیر جھوٹ
کھاتا آتا ہے]

امیر : پردہ کھول اور منہ بتاؤ ۔

ڈالڈیا : (اپنے دل میں) یہ کیا لیتا تھا ۔ ایک طمانچہ سے سترہ
گلاٹ کھائے ، ایسا ہے ۔ (ظاہر میں) اے کا کا جی !
دیکھنے کی بات نہیں ، لینے کی بات ۔ لنگری میں کچھ
زور ہو تو آنا ۔

امیر : اے بے ادب ! ملاحظہ مت چھوڑ ! کیا مسخری لگائی
ہے یا بیچنے کو بیٹھا ہے ؟

ڈالڈیا : پاؤں میں زور ہے ، یعنی خریدنے کو پیسہ ہے ؟

امیر : تو مجھے کیا پہچانتا نہیں ؟

ڈالڈیا : صاحب ! اچھی طرح سے پہچانتا ہوں کہ آپ بڑے
امیر ہیں مگر لایق آپ کے یہ عورت نہیں ہے ۔ آپ
لے کر کیا کریں گے ؟

امیر : جہنم میں ڈالوں گا ، اس میں تیرے باپ کا کیا جاتا
ہے ؟

ڈالڈیا : بھلا قیمت کی کچھ خبر ہے ؟ ایک گز کا کُندہ بنا

کے سونے سے بھرپور کر دینا پڑے گا ۔

امیر : بس اتنا ہی ؟ اتنے کی کیا درکار ، لیکن اس کو دیکھنا چاہیے ، دیکھے بغیر کیسی لیوے ؟

ڈالڈیا : تب تو بلا شک دیکھ لو ۔

خورشید : (پردہ کھلتے ہی جھنجھلا کر)
چل چل موے ابلیس ! ادھر سے منہ کالا کر ۔

[پردہ ڈال دیتی ہے]

امیر : یہ مزاج کی کتی کو لے کر کیا کرے ؟

ایک سوداگر: دیکھو تو سہی ، کتنا ہے دماغ ۔

دوسرا سوداگر: جو لونڈی ہووے ، اسی کی کم بختی ۔

امیر : مرنے دو ۔ اس میں کچھ نفع نہیں ۔

ڈالڈیا : چاچا جی ! میں نے تو پہلے سے کہا تھا کہ آپ کا کچھ ہونے والا نہیں ۔ اب تو وقت قہر کا ہے ، اس کی کچھ خرید کرو ۔

امیر : چھٹ چھٹ ! میں تو ایسی رانڈ ٹھوکر سے ماروں ۔

[جاتا ہے]

ڈالڈیا : کوئی ہے ؟ آجاؤ ، آجاؤ ! وقت ہاتھ سے جاتا ہے ۔

[کئی ایک دہقانی ایک طرف سے آتے ہیں]

ایک دہقانی : بھائی یہاں کیا گڑبڑ لگائی ہے ؟

دوسرا دہقانی : (جو پہلے سے وہاں کھڑا تھا) دوستو ! بھلے آئے ۔ اِدھر تو بادشاہ کی بیگم بیچی جاتی ہے ۔

ڈالڈیا : تولہ ! تولہ ! کیا بکواس کرتے ہو ؟

تیسرادہقانی : سب مال کر دس دونے سونا ہوگا ۔

ڈالڈیا : (تعجب ہو کر دھتوں سے مارتا ہے)۔کم بختو! نکلو یہاں سے ۔

پہلا دہقانی : ارے کاہے کو مارتے ہو ، پندرہ تولے لو ۔

[کوروں چز نر لات اور مکوں سے مارتا ہے]

چوتھا دہقانی: بھلے آدمی اتنا خفا نہیں ہوتا ۔ لو جی بیس تولے لو ۔

[سب کو دھکے مار کر نکالتا ہے]

کوتوال : چلو اب پیچھے لے چلو ، کوئی خریدار تو نہیں اور کسی کی طاقت بھی نہیں ۔

ڈالڈیا : مہربان کوتوال ! تھوڑی سی دھیرج دھرو ، کوئی بھی غنی مرد آئے گا ؟

[بہادر خان نام کا ایک نوجوان جھونپ میں داخل ہوتا ہے]

بہادر خان : ابھی ایک سوداگر فیروز شاہ نام ، ہر قسم کا مال بھرے ہوئے ، سات جہازوں لے کر بندر میں آ پہنچا ہے ، وہ یہ خبر سن کر شتاب خریدنے کے لیے حاضر ہوتا ہے ۔

[ایک نوجوان خوب صورت سوداگر اپنے نوکروں کے ساتھ با دمام داخل ہوتا ہے]

فیروز شاہ : جو خورشید پر نور سارے جہان میں مشہور ، ان

کو ایسی بے حرمتی سے بچنے کا کیا باعث ہے ؟

ڈالڈیا : شاہ نے اپنی بیگم پر ناخوش ہونے کے سبب ظاہر میں بیچنے کا فرمان دیا ہے ۔

فیروز : بڑا افسوس ہے ۔ ایک نازک ، ناز آفرید ، نازک بدن ، ناری پہ ایسی بے حرمتی اور گستاخی کرنا ! لیکن ایسی شہرہ آفاق کی قیمت بہت زیادہ ٹھہرائی ہوگی ؟

ڈالڈیا : شاہ کا حکم ہے کہ جو کوئی کم از کم ایک گز اونچا اور ایک گز چوڑا کنڈ سونے سے بھر دے ، اُسی کو دینا ۔

فیروز : ظاہر میں تو یہ رقم بہتیری ہے لیکن اس کے مبارک نام پر سب قربان ہے ۔ میں نے خورشید بیگم کی شرافت و کاملیت بہت سنی ہے ۔

کوتوال : (دل میں) مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ حریف بازی چھٹکا نہ لے گا ۔

فیروز : آن کا چہرہ بتاؤ گے ؟

کوتوال : (گھبرا کر) چہرہ وہرہ کچھ نہیں دکھاؤں گا ، ویسے ہی لینا ہو تو لو ۔

فیروز : فقط میں اسی کے نام سے ہی بہ جان و دل قربان ہوں، ایک نظر دیکھنا بھی خوب ہے ۔

[خورشید نے خود بہ خود پردہ اٹھا کر فیروز کو چہرہ دکھایا]

خورشید : (محبت سے اشارہ کر کے)

جوہر کی جوہری کرے پہچان
مورکھ آگے ہیرا ہے کانچ سمان

یہ ڈال دیا موا ڈھ نے سمجھ کے سنگ
اٹھالے اسے جوہری ہوگا دوات مند

فیروز : بس بس ، ایک گز کا کنڈ شناب میں بھر دیتا ہوں ۔

کوتوال : (گھبرا کر دل میں) کمبختی! بڑی ہاتھ سے جاتی ہے ۔ (ظاہر میں) اس پر چڑھائی کر ، سوائی بھر دوں گا

[فیروز گھبرا تا ہے ۔ خورشید اشارہ کرتی ہے]

فیروز : بس ڈیڑھ گز دیتا ہوں ۔

کوتوال : میرا پورے دو گز !

فیروز : میں دو گز دوں گا ۔ سب مال و اسباب اور جہاز بیچ کر فارغ ہو جاؤں گا ، لیکن اس ماہ رو کو کبھی نہ چھوڑوں گا ۔

[کوتوال نا امید ہو کر دیکھتا ہے]

ڈالڈیا : کوتوال صاحب ! ہجوں بدھنیے" کی کوئی مرضی ہے ؟

کوتوال : (دلگیری سے) میں نے چھوڑ دی ۔ دیکھوں تو سہی ، یہ لے کر کیسا فتح مند ہوتا ہے ۔

خورشید : (شتاب کھڑی ہوکر ، فیروز کا ہاتھ محبت سے پکڑ کر کوتوال کو) حرام کھانے والے ، نیچ لوگوں کے نا امید ہونے سے میں بہت خوش ہوئی ہوں ۔ کھرا خریدار اور سچا دار تو یہی ہے ۔ اسے بے ادب جا ! اپنے مرنے گھوڑے کی چروا داری کر ۔

فیروز : چلو کرداں صاحب ، تمہارے دو موض کی نسن کر دیتا ہوں ۔ (بہادر خاں سے) بہادر خاں ، اپنا سب مال و اسباب اور جہاز بیچ کر ان کو پورا کر دینا ۔

[خورشید اور فیروز شاہ وہاں سے نکل جاتے ہیں]

باب دوسرا

پردہ پہلا

کوتوال کی کچہری

کوتوال : (سپاہی کو) جا ابھی نوچا ، میرا مغز برقرار نہیں ہے -

سپاہی : مگر غریب پرور ! وہ قیدیوں اور فریادیوں کا کیا کرنا ہے ؟

کوتوال : شتابی سے کہہ دے ، فریاد کیا ہے ؟

سپاہی : بندہ نوازا! ایک مرد فریاد کرتا ہے کہ اپنی جورو کو ایک دوست لے کر بھاگا ہے -

کوتوال : اس کو کہنا کہ اپنی جورو کو دوست کے ساتھ جانے دو اور تم دوست کی جورو کو لو -

سپاہی : خداوندا! ایک چور نے کسی سوداگر کے یہاں چوری کی اور خود چور سپڑا[1] گیا ہے -

کوتوال : جو ملا ہوگا اس میں سے آدھا مال سوداگر کو پہنچا[2] دو - آدھا سرکار کے واسطے میری کوٹھی میں رکھو اور چور کو بھاتا[3] دے کر چھوڑ دو -

سپاہی : صاحب ! کوئی عورت پر دو فرد دعویٰ کرتے ہیں -

کوتوال : اے احمق ! اتنا بھی آتا نہیں - عورت کو زنان خانے میں بھیج دے اور مردوں کو دھکے مار کر ہنکال[4] دے -

سپاہی : خداوند ایک ــــ

کوتوال : کمبخت ایک ایک کر کے سب کہا گیا ۔ بس جاؤ یہاں سے ، ابھی مجھے زیادہ تکلیف مت دو ۔

[تمام وہاں سے بھاگ جاتے ہیں]

کوتوال : (ا شلا) خورشید ! اے خوشخدار ! آخر تو میرے چنگل سے چھوٹ گئی، لیکن میں تیرا پیچھا نہ چھوڑوں گا ۔ تجھے با شوق سے چاہتا ہوں ۔ تو پری ، جنت کی حور ، روئے زمیں پر مانند تیرے کوئی بانو نہیں ۔ تیرے بغیر شاہوں کے حرم خانے کو زینت نہیں ۔ پر تعجب ہے کہ مانند میرے ایک صاحبِ حشمت اور امیر سلطنت کو چھوڑ کے ایک سوداگر بچے کے ساتھ نکل گئی ۔ افسوس تیری بے وفائی پر کہ تو نے میری کچھ قدر نہ جانی ۔ یاد رکھ اے دلدارِ بے وفا ! کہ تیرے اوپر پڑے جفا ، تیرے سوداگر کو کروں صفا ، تب ہی میں کوتوال بچہ ٹھہرا ۔ یہاں کوئی ہے ؟

سپاہی : خداوند ! بندہ حاضر ہے ۔

کوتوال : ابھی کا ابھی وہ فیروز شاہ سوداگر کے نفر بہادر خاں کو بلا ۔ (سپاہی جاتا ہے) کبھی اس نفر سے مغرور خورشید اور اس سوداگر بچے کی کچھ باتیں ملے گی ۔

[بہادر خاں کو لے کر سپاہی داخل ہوتا ہے]

کیوں اے کافر ! تو ہجوں نہیں سمجھتا ؟ اور سچ بات نہیں کہتا ۔ ابھی کہہ دے تیرا صاحب اور وہ خورشید بیگم کدھر نکل گئے ہیں ؟ راستہ بتا دے ، نہیں تو ابھی دھڑ سے سر اکھڑ جائے گا ۔

بہادر خاں : (دل میں) افسوس دنیا کیسی دورنگی ہو گئی ہے۔
میں کون ، فیروز کون اور یہ بدمعاش کون ۔ اس
کو کہاں خبر ہے کہ فیروز شاہ جہاں دار بادشاہ
کا بیٹا اور میں بہادر خاں وزیر کا بیٹا ۔ فقط ہمدردی
کے لیے میں نے فیروز کو مدد دی اور آج اس بد نوبت
پر پہنچا ہوں ۔ یہ کنگال کوتوال مجھے نفر بوجھتا
ہے ۔ مگر وہ بے خبر ہے کہ اپنے مانند تو سینکڑوں
نفروں[۸] میرے شاہ کی بیٹی میری عزیز دل گلنار کے
جوتی بردار ہیں ۔

کوتوال : اے غلام ! زبان میں کیا دھندناتا[۹] ہے ؟ شتابی
سے بول !

بہادرخاں : صاحب ! میں فکر کرتا ہوں کہ کبھی آدم کا سر
اکھڑ جائے تو کس طرح اس سے سخن نکلتا ہوگا ۔
کیونکہ آپ مجھ سے خبر بھی چاہتے ہو اور سر بھی
اکھاڑتے ہو ، تو ایک دفعہ میں ، دونوں کس طرح سے
ہو سکے گا ؟ کوتوال صاحب ! میرا سر گرنے کے بعد
مجھ سے سخن کہا جائے گا ؟

کوتوال : اے بے وقوف غلام ! یہ ڈھونگ کیا رچاتا ہے ؟
درست جواب دیتا ہے کہ نہیں ؟

بہادر خاں : (ہنس کر) ہاں ہم غلام ۔ غلام کو تو مول دے
کے خریدتا ہے ۔ میرے صاحب کے پاس خرید کیے
غلام بہت ہیں ، میں اپنے صاحب کا خرید کیا ہوا نہیں
ہوں ، آپ نے مجھے مول دے کر لیا نہیں ہے ، مجھے
تو پکڑ منگوایا ہے ۔ اس لیے اب مجھے چھوڑ دو کہ
میں اپنے صاحب کو پکڑ لاؤں ۔ کیوں سچ ہے کہ نہیں ۔

کوتوال : اے دیوانے ! ابھی مشکیں ناٹ[10] کرواؤں گا ۔ سچ بتائے گا کہ نہیں ؟

بہادر خاں : صاحب ! دیوانے کو مار کر کیا نفع پاؤ گے ۔ دیوانے کو چاہیے سو مارو لیکن وہ دیوانے کا دیوانا ۔ دیوانے کے ساتھ جو گفتگو کرتا ہے وہ بھی دیوانا ہوتا ہے ، نہیں صاحب ؟

کوتوال : اب اپنے صاحب کی بات چھوڑ دے ۔ وہ خورشید کی خریدی سے تمام لاچار اور خوار ہو گیا ہے ۔ اب اس کے ہاتھ سے تیرے حق میں کچھ نفع نہیں ہوگا ۔ سن ! میری نوکری میں تجھے فائدہ ہے ، کچھ مغز میں آتا ہے ؟

بہادر خاں : ہاں خداوند ! آتا ہے ۔ ارے پھر نکل گیا ۔ ہاں تھوڑا سا آیا ۔ اب بہت آیا ۔ ارے پھر بھاگ گیا ۔

کوتوال : (دل میں) کوئی بڑا ہی احمق ہے ، اب دیکھیے کچھ چاپلوسی سے تابع ہوتا ہے ۔ (بہادر کو) میں سوچتا ہوں کہ تو بڑا سیانا ہے ۔

بہادر خاں : واہ ! ابھی تو دیوانا کہتے تھے اور اتنے میں سیانا کیوں کر ہو گیا ؟ میں سیانا ہوا کوتوال صاحب ! اس لیے میں آپ کا احسان خواہ ہوں ۔

کوتوال : لے یہ اشرفی کی تھیلی لے اور کہہ دے کہ تیرا صاحب کہاں ملے گا ؟

بہادر خاں : (دل میں) اب تو کچھ فندی کر ، عقل مندی بتا کے کھیسا بھرنا اور رفیق کا بچاؤ کرنا خوب ہے ۔

[کھیسے سے کاغذ نکال ، باچ[11] کے]

سبج[12] شہر میں میرے صاحب نے بہت سے مال و

اسباب کی بکھاریں[۱۳] بھری ہوئی ہیں ۔ وہاں جانے کا
اس کا ارادہ تھا تو مقرر وہ وہاں گیا ہوگا ۔

کوتوال : راست کہتا ہے ، اس کی ملاقات سبج شہر میں لگی ہوگی ۔

بہادر خاں : ہاں صاحب ملاقات لگی ہوگی ، بن ڈھل وہاں جانا ۔

کوتوال : وہ تیرے صاحب کا لباس[۱۴] پڑا ہے ، اس لباس میں کوئی دن تو نے اس کو دیکھا تھا ؟

بہادر خاں : ہاں صاحب ! ان کو یہ پوشاک بہت پسند ہے اور وہ ہمیشہ ویسی ہی پوشاک پہنتا ہے اور اس میں سوداگری کا درجہ بوجتا[۱۵] ہے ۔

کوتوال : جب ایسا ہے تو میرے حضور لا وہ پوشاک ۔ اگر میں دھاری[۱٦] مقصد پر پہنچوں گا تو تجھے زر سے نوازش کروں گا ۔

[بہادر خاں جاتا ہے]

یہ پوشاک پہن ، سوداگر بن کے اول وہ سوداگر بچہ فیروز شاہ کو قتل کرنا ۔ پھر خورشید کے حضور پہنچ کر با فند و فریب اس کو اپنے چنگل میں لانا ، اچانک سوداگر بچے کو ٹھار کر[۱۷] ان کے ہی لباس میں وہ ہٹیلی رانڈ سے ملوں ، اور پیچھے سے ظاہر ہو کر اس کو چینڈھ چینڈھ کے[۱۸] ٹھکانے پر لاؤں اور آخر اس کے ساتھ نکاح کروں ۔ تب ہی میرا غصہ سما جاوے[۱۹]، یہ جوگتا[۲۰] تو بہت خوب لگتا ہے ۔

[کوتوال خوش ہو کر جاتا ہے]

بہادر خاں : (داخل ہو کر دل میں) سچ ، لباس تو میرا فیروز

کا ہے ، ایک بار بھن کے خورشید کے حضور جانے تو بے شک وہ اپنا خاوند سمجھے، مگر یہ موتی کوتوال کو میں نے جس شہر کا نام بتایا ہے ، وہ غلط ہے۔ عمر بھر پھرے گا تو بھی اس کا پتا لگنے والا نہیں ۔ توبہ، خدا ، جس کا اب تک نمک کھایا اس کے ساتھ اب کیا دغا کروں ؟ اور یہ جلاد تو اس کا پتا دے کر کیا اپنے ہمدم کا خون کرواؤں ؟ جو کام میں شیطاں اچھے" اس کام کو میں بندہ ہو کر کروں ؟ نہیں نہیں ! میں بھی اپنے نمک رساں صاحب کی تلاش میں جاؤں اور یہ سب بات اس کو کہہ دوں ، مگر عزیز از جان گل چہرا ! تو بغیر میرے کیسے جو ہوڑتی" ہوگی ۔ تیرے برادر کی خاطر داری کے لیے میں نے تجھ کو چھوڑا ہے ۔ مگر امید رکھتا ہوں کہ چند روز میں آکر تیرے شہد سے لب کو شیریں کروں گا ۔

|جاتا ہے|

باب دوسرا

پردہ دوسرا

سندھ شہر میں ایک باغ

[فیروز شاہ اور خورسید باہم بیٹھے ہیں]

فیروز شاہ : اے خورشید پیکر ! تو نے جیتے جی مجھ مسکیں کو باغِ بہشت میں پہنچا دیا ہے ۔ اے ماہ عالم ! تیری خوب روئی کے اوپر میں بہ جان و دل فدا ہوں ۔ تیری جھمک دیتی مورت پر میں اشک باری اور خوش حالی نثار کروں گا ۔ آفرین تیرے حسن پر کہ وہ سنگ و آہن کو موم بناوے اور شیر و پلنگ کو سیر نمائے[1] کریں ۔ اور آبِ دریا کو زمین پر چلائے اور آدم کے لہو کو رگ رگ میں دوڑاوے ، ویسا ہے ۔ با ایمان کہتا ہوں ، بس تو انسان نہیں پر کوئی پری ہے ۔ اے میری جان ! تو بے ڈر رہ ، جب تک یہ قالب میں جان ہے ، تب تک تیری رفاقت و حفاظت کروں گا اور تیری خوشی نا خوشی میں ہمیشہ ہی جوڑا جاؤں گا[2] ۔

خورشید : اے محبت پناہ فیروز شاہ ! ایسی زبان کہاں سے لاؤں کہ شکر تمھارے احسان کا ادا کروں ۔ بال بال میرا آپ کے لطف و کرم کا ثنا خواں ہے ۔ آپ کی

ابریشمی زلفوں کے تار و تار پہ میں صدقے ہوں کہ آپ نے اس بے قرار دل کو اس بے قدر اور بے وفا فتح شاہ کے پنجے سے نجات دے کر، دوبارہ لباسِ پیکرِ انسانی پہنایا اور میری خاطر آپ سے مال دار تجّار نے اپنی دولت و حشمت ایک پل میں کھو دی۔ یہ آپ کی محبت اور مہربانی کچھ کم نہیں جاتی، مگر یاد رکھیے کہ فیروز سوائے خورشید نہیں اور خورشید سوائے فیروز نہیں۔ اس ظاہر میں دو لیکن باطن میں ایک ہی بوجھ۔

فیروز شاہ: عزیز خورشید! آفرین ہے تیرے سخنوں پر۔ اللہ تجھے مہربان رکھے اور تمام درد و دکھ سے آرام و راحت دیوے۔ میں تو بس تیری تجلّی سے مارا گیا ہوں۔ اب میں جان و دل سے تیری خدمت گزاری میں حاضر ہوں۔ تیرے آرام کو اپنی راحت پر مقدم جانوں گا اور ہر صورت سے تیری تابع داری کروں گا۔

غزل

خورشید:

آنکھ کیوں تو نے (بھلا) ہم سے ملائی پیارے
بجھ گئی تھی، سو پھر اب آگ لگائی پیارے
دوستی میری تری یار! نبھاوے اللہ
گرچہ بدنامی زمانے میں اٹھائی پیارے
خانۂ دل میں مرے بھڑکے ہے (اب) آتش عشق
شکل تو نے جونہی اپنی (یہ) دکھائی پیارے
میں سوا تیرے کسی کو بھی نہ دیکھوں ہرگز
سامنے اپنے اگر ہووے خدائی پیارے

ہفت اقلیم کی شاہی نہیں خوش آتی ہے
خوش نما ہے ترے کوچے کی گدائی پیارے

فیروز : غزل

میں وہ نہیں (ہوں) کہ تجھ سے دل مرا پھر جائے
پھروں میں تجھ سے تو مجھ سے مرا خدا پھر جائے
الٰہی وہ نہ پھرے جس کے غم میں مرتا ہوں
بلا سے حلق اوپر خنجرِ جفا پھر جائے
تری گلی سے میں ہرگز نہیں سرکنے کا
اگرچہ لاکھ دفعہ سایۂ ہما پھر جائے
یقین ہے کہ جدھر (کو) تو دل ربا پھر جائے
مثالِ قبلہ نما دل مرا سدا پھر جائے

[غزل پوری کر کے بوسہ لیتا ہے]

جانِ من! خورشیدِ فلک تو فقط آنکھوں کو روشنی دیتا ہے لیکن تُو زمین کا خورشید، میری چشموں کو زیادہ اجالے کے ساتھ جان کو بھی چمک دیتا ہے۔ اس دنیا میں مجھے جو کوئی عزیز ہے تو اکیلی تُو ہی ہے۔ سچ مان کہ تُو میری رگوں میں خون کے ساتھ مل جا کے میرے جگر میں بادشاہی کرتی بیٹھی ہے۔ بول دے پیاری! میرے سے تجھے کون سی چیز کی غرض ہے؟ جو بھی طلب ہووے وہ آنکھوں سے حاضر کروں۔ اتنا ہی افسوس ہے کہ تُو شہنشاہ زادی کی حشمت بچانے کے لایق اب میرے پاس زر و مال نہ رہا ہے، پر کھاتری رکھ کہ آج ظاہر میں مجھے جو درجے پر دیکھتی ہے، اس سے میں

! نر ہوں ۔ میرا حسب و نسب جب آشکار ہو گا
تب تجھے زیادہ خوشی در پیش آئے گی ۔

خورشید : کاہے کو افسوس کرتا ہے جان ! اگر دولت نہ رہی تو کیا مضائقہ ۔ ان کے پاس محبت کی صندوق بھری ہے، جو پھر اس کے آگے زر کی صندوق لیے چیز ہے ۔ دنیا میں اپنے مانند تونگر کم ہوں گے ۔ اے دلدار یار ! کچھ بھی اندیشہ مت کر ۔ یہ میرا حسن فقط دیکھنے کا نہیں ، ہنرمندی میں میرا نام جہان میں مشہور ہے ۔ اگر میرے پاس زر نہیں تو ہنر رکھتی ہوں اے جواں مرد ! تو فقط ایک اسارے سے انمول چیزیں میرے اوپر گنا کر آج بغیر زر کے پریشان خاطر ہوتا ہے ، لیکن بےخوف رہ ، تیری گنائی ہوئی دولت کا بدلہ جلدی سے دوں گی ۔ لے یہ چادر ہاتھ میں لے اور اس شہر کے بازار میں جا کر بیچ ڈال ، مگر ایک لاکھ ٹکے کی قیمت سے کم تر مت بیچیو ۔ میں نے یہ فتح شاہ کے محل میں گوشے[۳] رکھی تھی اور وہاں سے گپ چپ[۴] یہاں لائی ہوں ۔

فیروز شاہ : (چادر دیکھتے ہی چونک کر) واہ کیسی چمک ! کیسی صفائی ! کیسی صنعت خدائی ! کیا فرشتوں سے بھی ایسی کاردوزی ہووے ؟ اے فیروز ! راحت راحت ، ہمیشہ تجھے راحت کہ تیرے آغوش میں ایسی جان فزا حسن کے ساتھ دانشمند اور ہنرمند غمگسار ہے ۔ لیکن شرم ہے مجھے کہ میں مردانِ مرد کہلاتا ہوں تو با زحمت تیری حفاظت و حمایت کرنا مجھے چاہیے ۔ اس کے بدل تیرے احسان کے

غار میں غرق ہوتا ہوں ۔

خورشید : جان من ! یہ کیا سخن ؟ اگر ایک برس بھر میرے مانند سو عورتیں ہر روز ، ہر ایک ایسی سو چادر بناوے اور تجھے بخشے تو بھی میرے اوپر ہوئی تیری مہربانی کا عوض ادا نہ ہووے ۔ بس میری جان ! مت بول زیادہ ، میں زیادہ شرم سار ہوتی ہوں ۔ آپ کا حق احسان میری گردن و جان پر اتنا ہے کہ اگر میرے بدن کی جلد سے جوتی بنا کر پہنے تو بجا ہے ۔ اب تم کب پیچھا پھرو گے ؟ یار کے روشن دیدار کے بغیر ایک پل مجھے ایک سال کے مانند دراز گزرے گی ۔ سدھارو میرے پیارے ! محبت کی روشنی سے سیدھی راہ چلے جانا اور یہ محبت کی صنعت کا نادر نمونہ با خوشی پیچنا ، اور خورشید کی تیز تاب کی مدد سے جلدی قدم پیچھا پھر آنا ، ایک بغل گیری کر ، ایک بوسہ دے اور سدھار میری جان ۔

فیروز شاہ : پیاری اب میں رخصت لیتا ہوں ۔

خورشید : تمھاری رخصت گویا میری جان کی رخصت ہے ۔

[فیروز ، خورسید کو بوس و کنار کرکے حادر لے کے جاتا ہے]

پردہ تیسرا

سندھ شہر میں بادشاہ ملک شاہ کا دربار

[دربار میں جتنے بھی امیر، امرا جو کہ سندھی ہندو ہیں،
آپس میں مل کے شاہ کے ایک مسخرے غازی خاں کے
ساتھ ٹھٹھا بازی کر رہے ہیں۔ اور وہ غازی خاں بڑا
چور ہے]

غازی خاں : تم سب بھاجی کھاؤ، میرے نزدیک کیا حساب؟
میں ابھی کڑ کڑا کر ایک ایک تھوبڑے میں لگاؤں
تو زمیں کا دوست بناؤں گا، اور چاہوں تو ملک شاہ
کے بے ادب سندھی امراؤں کے سروں پر ہاتھ کی
اچھی سی ٹھونک بتاؤں۔

پہلا امیر : (غازی خاں کو نزدیک بلا کر) واہ واہ ماں جہان
میں تلوار[1]! غازی تو ایسا پاجی ہے کہ تجھے راضی
رکھنے کے لیے قاضی بنانا چاہیے۔

[یوں کہہ کر دھکا مارتا ہے۔ غازی جھنجھلا کر اسے
ٹھونکنے کو جاتا ہے]

دوسرا امیر : اے سورا سردار[2] خبردار! رہنا استوار، میں تیری
پیٹھ سنبھالتا ہوں۔

[غازی خاں کو دھپّا[۳] مارتا ہے - غازی خاں اس کے مقابل ہوتا ہے - اسے میں تیسرا امیر اس کو دھول جھکڑ کرتا ہے اور ہنسی ہو جاتی ہے - اسے میں وزیر داخل ہوتا ہے]

وزیر : یہ کیا بے ادبی بھرا تماشا! یہ دربار ہے یا بھنگڑ خانہ؟ تم بخت غازی خاں! یہ سب تیرا گھمسان اور طوفان ہے - کبھی ایسا پھر دیکھوں گا تو جھٹ تجھے قید خانے میں بھجوا دوں گا -

غازی خاں : (دل میں) دیکھا یہ ظلم! مفت میں دھپّوں کا مار، وزیر کی گار[۴]، درباریوں کی پیزار، اس میں بجتا ہے میرا بار[۵]، یہ کیسا کہا جائے[۶] - کچھ پروا نہیں، میں نے بھی گھاٹ بنا رکھا ہے، فقط شاہ کے آنے کی دیر ہے - دیکھیں دوستو، پیچھے در[۷] ایک دھپّوں کا ایک ایک بدلہ لوں گا -

[اتنے میں نقیب پکارتا ہے]

نقیب : نگاہ رکھیو نگاہ! نوابِ عالی جناب، عزت مآب، مہر تاب، ملک شاہ کے مبارک قدم پر!

[بادشاہ دبدبے سے داخل ہوتا ہے - اس کے پس و پیش کوتوال، ندیموں اور درباریوں حاضر ہیں، رامش گریں بھی ساتھ ہیں]

ملک شاہ : آپ سبھوں بخیر و عافیت ہو؟

غازی خاں : (کچھ گم سم) جہاں پناہ کی دولت سے سب امن و چین، لیکن ایک بات نئی ہے - آج سے بندے کو غازی خاں کے بدلے دھپّے خاں کا القاب ملا ہے -

خداوند ! میرا گھر دھنوں کے دھڑوں سے دھندر کے دھندلا ہو رہا ہے اور اس کے خشک شے سے یہاں سے وہاں چکری لہ د ہے۔ لامور شاہ : وہ دلبر بادشاہ زادی خورشید کی یاد میں جب یہ رامس گریں گاتی تھیں، سب ہمہ تال سر نے... کی فریاد اٹھاتی تھی۔ لیکن اپنے یہاں اچھا ساز موجود ہے۔ اس کی تو کسی نے اب تک خبر نہ لی تھی۔ آج اپنے دربار کے امیروں نے مصلحی بن کے میرے سر کا طبلہ بنایا اور ہر ایک نے اس پر امتحان لیا۔ تو کیا خوب بات، اس طبلے پر تو ایسی تال لٹھ گئی کہ سب ہی خوش حال ہو رہے تھے۔ اتنے میں وزیر صاحب قدم فرما ہوئے اور انہوں نے بھی میرے طبلے پر ایک زیادتی تھاپ لے کر ایک اچھا سخنوں کا گانا گالیا۔

وزیر : (بازو سے) دیکھو کم ذات سوئے سانپ کو جگاتا ہے۔ اے غازی ! بھلے آدمی! خورشید کا نام یاد مت دلا !

غازی خاں : (دل میں) سانپ کو جگاتا۔ بجے جئو۔ یہی اژدہا کے منہ سے تم کو ڈسوا کر ایک ایک دھتے کا مہنگا دام لوں گا۔ غازی کے ہاتھ میں داؤ کی بازی آئی تو پھر بندہ خراج قاضی[8] نئے گا۔

ملک شاہ : کیا وماسن[9] کرتا غازی ؟

غازی خاں : جہاں پناہ ! وماس یہ ہے کہ آج کے دن رامش گریں گاتی کیوں نہیں ؟ جو گانے لگیں تو میرے سر کی ذرا سی آزمائش ہووے۔ اور آپ کے حضور میں وہ کیسا بجتا ہے اور ان سبھوں میں کون سا طبلچی خوب بجاتا ہے، وہ بھی دیکھ لینے میں آوے۔

[سب کوئی ہنستے ہیں اور رامش‌گریں خورشید کی تعریف میں یہ گانا گاتی ہیں]

رامش‌گریں :

غزل

تجھ[10] مکھ کی تاب دیکھ کے ہوا بے قرار ملک[11]
جلتا ہے بزم عشق میں پروانہ وار ملک
از بس کہ تجھ خیال میں اے چشم خوں فشاں
انتظاری سے ہوتی ہے انکھیاں بے زار ملک
آ بزم عشق میں شتابی اے خورشید
ہر شب ترے فراق میں ہے اشک بار ملک

غازی خاں : (بادشاہ کو) آج شادی کے ہنگامے میں ذرا سا غمی زہر ڈالنے کی مرضی ہوتی ہے - جب بندہ آپ کا غلام نمک خوار ہے تو مجھے لازم ہے کہ آپ سے کچھ بھی چھپانا نہیں - ایک بات پیچھے سے جانی جائے یا پہلے سے ، دونوں ایک ہی ہے -

ملک شاہ : خوش طبع غازی ! تجھے غمی کاہے کی ؟ کچھ کم و بیش تجھے پڑا ؟ کیا تجھے خور و پوش کی تنگی ہے ؟ بول دے ، ہے کیا ؟

غازی خاں : خداوند ! آپ کے امور دولت کھانا کھلانے میں تو بڑے بہادر ہیں لیکن سستی اور کاہلی انھیں کا خواص ہے - نہ کسی کا خوف ، نہ کسی کی درکار ، پر آپ کی بھی نہیں - (دل میں) دیکھو اب نابکاروں کے منہ -

---

۱۰ - تجھ مکھ کی تاب دیکھ کے ہوئی بے قرار شمع - (مترجم)
۱۱ - تقریباً تمام اشعار کذا -

ملک شاہ: مقدور کس کی میری درکار نہ کرے اور خوف سے نہ ڈرے ؟

غازی خاں: (دل میں) اب آگ سلگی ہے ۔ (بادشاہ سے) خداوندِ جہان ! اگر میں کہہ دوں اور خدا نخواستہ خاطر آپ کی آزردہ ہو جائے تو ؟

ملک شاہ: کچھ پرواہ نہیں ، کہہ دے !

غازی خاں: تب تو سن لو غریب پرور ! جو سارے ہندوستان بلکہ سارے جہان میں مشہور ، مانند حور خورشید ، جس کی صفت و تعریف پر آپ خاوند مبتلا ہو ، جس کو ہاتھ لانے کے لیے ہزاروں تدبیر اور بہت سی محنت و شفقت آپ کرتے تھے ، وہ نازنین آخر کنچن کے موں سے چند روز ہوئے بیچی گئی اور ایک سوداگر بچہ لے کر گیا ۔ حیف ہے کہ آپ کی اتنی دولت و حشمت کے ساتھ آپ بے نصیب رہے ۔ سچ پوچھو تو دربار کے کار داروں کی اس میں بڑی سستی اور غفلت ہوئی ہے ۔

ملک شاہ: کیا خورشید بیچی گئی اور سوداگر نے خرید لی ؟ اور تم لوگوں نے بیٹھ کر دیکھا کیا ؟ تم نمک حراموں نے مجھے کچھ خبر بھی نہ دی ؟ حیف صد حیف ، میری امید ٹوٹ گئی اور حرمت فنا ہوئی ۔ ایک گوہرِ نادر ہاتھ سے گیا ۔ شرم و لعنت ہے تم حرام خوروں پر ، اتنے کام میں بھی بے درکاری ۔ اب تم احمقوں کا اس دربار میں کیا کام ؟ میں تاکید سے فرماتا ہوں کہ کیسا بھی کر ، سارا جہان پھر ، وہ خورشید کو سوداگر کے ہاتھ سے تین دن میں لا کر حاضر کرو !

گر نہیں تو خاطر جمع رکھو کہ تمھارا جان و مال خوار و خوار اور گھر و بار تور و[13] تاراج کروں گا۔ تمھاری آل و اولاد کو چکی میں پسواؤں گا اور تم کو جلاد کے حوالے میں دوں گا۔ تمام شہرمیں خون چلاؤں گا۔ شرم کرو! شرم!

غازی‌خاں: (دل میں) واہ واہ! اچھی سی پیزاربں نڑاتڑ بڑیں۔ اب تو صفت سے تھوڑی سی سرفرازی لبنا۔ (شاہ کو) بندہ نواز! میں تو کھرا غازی کہ خورشید بیگم کو لا ایک ہفتے میں حضور میں حاضر کروں گا۔ یہ بیچاروں پر مت خفا ہوجیو! جب ان سے ایسا کام ہووے تو پھر بنگوں[14] گا نجے کا کھپت کدھر ہووے۔

[اتنے میں خدمت گار ایک خوب نما چادر لے کر آتا ہے]

خدمت‌گار: (زمین بوس ہو کر) عالم پناہ! جناب کی ڈیوڑھی پر ایک سوداگر یہ منقّش دل کش چادر لے کر بیچنے آیا ہے، قیمت جس کی ایک لاکھ ٹکے کہلاتی۔ شہر میں کوئی قیمت پہچاننے والا نہیں ہے، تو وہ آرزو رکھتا ہے کہ اس چادر کے شاہ زمان خریدار ہوں۔

[شاہ دیکھتا ہے]

ملک شاہ: آفرین! یہ کارِ آدم نہیں لیکن جنات کا معلوم ہوتا ہے۔

[خوب غور سے ہرا پھرا کر دیکھتا ہے اور تعجب ہوتا ہے۔ کبھی تو خوش ہوتا ہے، کبھی فکر مند، اور بعد وزیر کے ساتھ کان میں کچھ چھپی بات چلاتا ہے اور چادر کو پھر سے دیکھتا ہے]

(خدمت گار کو) شتاب وہ سوداگر کو یہاں بلا!

[خدمت گار بلانے کو جاتا ہے ۔ اتنے میں شاہ او وزیر
آپس میں صحبت کرتے ہیں]

غازی خاں : (دل میں) چادر پہ چشم چونٹ" گئی ۔ اب دل میں
چھین لینے کی تدبیر کرتے ہو ۔ مالک بچارا مارا
جائے گا ۔ میں نے کہاں سے اس سدھاں چوروں کے
وہاں اترا ۔

[فیروز سوداگر آتا ہے]

ملک شاہ : اس چادر کے مالک کیا آپ ہی ہیں ؟
فیروز : ہاں جہاں پناہ !
ملک شاہ : تم نے کون سے بازار سے یہ خرید کی ہے ؟
فیروز : بندے نے کسی سے لی نہیں ۔ میں خود اس کا مالک
ہوں اور یہ کاری گری میری جورو کے ہاتھ سے بنی
ہوئی ہے ۔
ملک شاہ : کیا یہ کار دوزی آپ کی عورت نے کی ہے؟ (وزیر کے
ساتھ مشورہ کرتا ہے) آفرین اُن کی عقل و ہنر پر! تم تو
میاں بڑا قسمت دار کہ ویسی عورت کے مالک ہو ۔
غازی خاں : (دل میں) چادر کی بات تو ایک بازو ہوگی ، اب تو
نظر عورت پر بیٹھی ۔
وزیر : آپ کچھ اور بھی اسباب سوداگری رکھتے ہیں ؟
فیروز : نہیں صاحب ۔
ملک شاہ : انگشتری دیکھیے ، بہت عمدہ معلوم ہوتی ہے ۔
فیروز : جہاں پناہ ! یہ بیچنے کی نہیں ہے ، یہ بندے کو اپنی
مہردار سے ملی ہوئی نشانی ہے ۔
وزیر : آپ کی چیز آپ کو مبارک ہو لیکن نام دار شاہ کو

ذرا دیکھنے دو ۔

فیروز : با خوشی سے (انگوٹھی دیتا ہے) ۔

ملک شاہ : (وزیر کے ساتھ مصلحت کر کے) واہ کیا آبدار الماس ہے' اگر بیچنے کا ہوتا تو منہ مانگی قیمت سے لیتا ۔ اے نیک بخت سوداگر ! میرے ساتھ ذرا سا محل میں چلو ۔ میں اس چادر کو بیگم کو بتا کے کبھی پسند ہو تو مول چکا دوں ۔ (شاہ وزیر اور فیروز جاتے ہیں اور سب محفل سر جھکا کر چپ بیٹھتی ہے) ۔

غازی خاں : (ہنستے ہنستے) دیکھو جی ! اس کا ہی نام طوفان ؛ غازی خاں نے گنجفہ کی ایسی ایک بازی کھیلی کہ سب کو راضی و راضی ہو گئے (امیروں کے نزدیک جا کر ایک کو) تین روز میں جلاد کے حوالے، یہ تو اک دھپتے کی قیمت ہے ۔ (دوسرے کو) آل اولاد چکتی میں ۔ یہ دوسرے کی قیمت ہے ۔ (تیسرے کو) بھائی خورشید بیگم ڈھونڈ لانا ۔ یہ تیسرے دھپتے کی قیمت ہے ۔ اب کیسے منہ کالا کر کے اوندھے پڑے ہو ؟ توبہ کرو ! آپ نے کس کو چھیڑا ہے ؟

ایک امیر : (چڑ میں) اے موذی غازی دھیرج دھر ، اول تجھے جہنم میں پہنچاؤں گا ۔

غازی خاں : ہاں ہاں ہاں ۔ پھر لمبی ٹوکی[16] ، کبھی جیتا رہا تو بعد از تین روز کے آئیو ۔

وزیر : (جھڑپ میں آ کر) اے غافلو! شتاب اٹھو اور اللہ اکبر کی بندگی ادا کرو ۔ اس رحیم کی کوئی کرامت غیب

سے تم ابھی خان سے بچے - اب جو سوداگر یہ چادر لے کر آیا تھا ، وہ چادر دیکھتے ہی شاہ نے دریافت کر لیا کہ وہ کام خود خورشید کے ہاتھ کا ہے - سب اس میں کچھ رمز و اشارہ ہے - سوداگر کو محل میں ٹھہایا اور گم پسٹپ خورشید کا نام کام پوچھ کر ان کو یا فریب بلانے کو بھیجی ہے - اب اٹھو! خوش حال ہو (غازی خان سے) اب کے وقت تو یہ حرام زادے کا فتور تھام رکھو ؛ بھی دیکھ لیں گے -

[سب دونی سبحان اللہ کہہ کے اٹھ جاتے ہیں

غازی خان : ایک ہی دیوانہ نہیں ، سارا شہر دیوانہ ہے - خود شاہ دیکھو تو لوگوں کی عورتیں لوٹنے میں مشغول ، درباری بھنگ اور گانجے میں مشغول ، کوتوال شہر لوٹنے میں مشغول ، وزیر جہازوں کے جہاز غرق کرنے میں مشغول - کیا راجا ، کیا پرجا ، سبھی چور نو پھر ادھر مجھے نفع کیا ہوگا - گُپ چُپ یہاں سے بھاگنا مصلحت ہے ، نہیں نو ان دغا خوروں کے ہاتھ سے مارا جاؤں گا -

[جاتا ہے]

باب دوسرا

پردہ چوتھا

سندھ میں خورشید کا مقام

[خورشید اکیلی بیٹھی خاوند کی تعریف میں گانا گاتی اور
چکر لگا رہی ہے]

خورشید : **گانا**

جس کو لذت ہے سجن کے دید کی
اس کو خوش بختی ہے صبحِ عید کی
مُکھ کے اوپر زلف اے دربائے حسن!
موج ہے یہ چشمۂ خورشید کی
دل مرا موتی ہو تجھ بالے میں جا
کان میں کہتا ہے باتیں بھید کی

[ملک شاہ کی دایائیں داخل ہوتی ہیں]

ایک دایا : (عجب ہو کے دوسری سے) واہ ! کیسی قبول صورت پری پیکر مورت ! گویا آفتابِ عالم تاب خود نمودار ہوا ہے ۔ اپنے شاہ کے حرم میں ایک بھی برابری کرنے والی اس کے تو نہیں ہے ۔

دوسری دایا : سچ ، ماہتاب جس کے دیکھنے سے بے تاب ہوجانے ، ویسی ہے ۔ گھر کا نشان اور پتا تو برابر لگتا ہے ۔

مگر اور بھی تلاش کرنا چاہیے کہ خورشید یہی ہے۔

تیسری دایا : (خورشید سے) نیک بخت بانو ! اس مکان میں سوداگر رہتا نہیں جو حال میں کسی شہر سے آ پہنچا ہے ؟

خورشید : (تعجب سے) ہاں جی ، کیوں ؟

تیسری دایا : ان کی نیک بخت عورت بھی یہیں رہتی ہوگی ؟

خورشید : آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں ؟

تیسری دایا : ان کا نام خورشید بیگم نہیں ؟

خورشید : (زیادہ متعجب ہو کر) اُن کے ساتھ کیا کام رکھتی ہو؟ کچھ فرمایش ؟

تیسری دایا : تب وہ بانو کیا آپ ہی ہیں ؟ فیروز شاہ سوداگر نے اپنی نیک بخت جورو کا ڈھپ چپ بتایا ۔ وہ نشان آپ میں معلوم ہوتے ہیں ۔

خورشید : تم کہاں سے آئی ہو اور کس نے بھیجا ہے ؟ ابھی وہ سوداگر ابھی کہاں ہے اور آپ مجھے کیوں پوچھتی ہو؟

تیسری دایا : نیک بخت بانو ! جو شخص چادرِ زر بیچنے بازار میں آیا تھا ، سو آپ کا خاوند ؟

خورشید : (گھبرا کر) ہاں کیا ہوا ؟ اس پر کچھ آفت وبلا آئی ؟ جلدی سے کہو تو ؟

تیسری دایا : نامور خورشید ! مت گھبرا ! آج اپنے بختِ بلند کو یاور سمجھو ، آپ کا خاوند خوش ہے ۔ مبارک قدم فیروز شاہ چادر لے کر شاہِ جہاں ملک شاہ کی ڈیوڑھی پر آ چڑھا ۔ چادر دیکھتے ہی بلند بخت شاہ نہایت خوش ہو گیا اور وہ سوداگر کا تمام حال و احوال دریافت فرما کر بہت سا تعجب ہوا ۔ پھر اس نوجوان کے حال پر رحم لا کے امیر و وزیر کو فرمایا

کہ ایسے ہنر مند اور پاکیزہ تن جوڑے کو اپنے
محل کے ہم سائے میں ایک عالی شان مکان دیوے
اور آپ کو بادشاہی بانوؤں میں سرفراز کرے ۔ شاہ
کی خواہش سے آپ کے خاوندِ نامدار نے آپ کو یاد
فرمایا ہے ، اور ہم داسیوں کو ساتھ ایک میانے (کے)
جو دروازے باہر کھڑا ہے ، بلانے بھیجا ہے ۔ اے
ماہ رخسار بانو ! اب بے خوف ہمارے سنگ چلو ۔

خورشید : (اندیشے میں) مجھے محل چھہل اور امیرانی سے کیا
درکار ہے ؟ میں نے بہت سا راحت و آرام پایا ہے ۔ اب
میں دکھ کی ساتھی ہوں اور فقط اپنے جگر کے پیار
محبت دار خاوند کی محبت میں راضی ہوں ۔ وہ نام آور
ایسا نہیں ہے کہ خود وہاں بیٹھ کر مجھے تنہا بلوانے
بھیجے ۔ سچ تو یہ ہے کہ بجلی کی تجلی مانند اس کی
محبت اڑاتی ، مجھے یہ بات پر شک آتا ہے ۔

تیسری دایا : آپ عقل مند ہو کر یہ کیا بولتی ہو ؟ خاوند کے حکم
کو حکمِ خدا بوجھنا چاہیے ۔ اگر وہ راضی تو خدا
خوشنود ۔ آپ اُن کے مبارک دیدار کی دوری سے بےچین
ہوتی ہو اور جب ایسا عزت مند اِذن بادشاہ کی خاص
دایاؤں کے ہاتھ بھجوایا تب آپ نافرمانی کی نشانی
بتاتے ، یہ تعجبی بھرا ہے !

خورشید : لیکن میری خاطر تسلی ہے کہ وہ میرا خداوند
کبھی ایسی رفتار نہ کرے ۔ وہ خود نہ آئے اور بغیر
پہچان والے تم لوگوں کو بھیجے !

تیسری دایا : وہ آج سے ملک شاہ کے دربار میں روکا گیا ہے ۔
شاہ اُس پر ایسا خوش ہو گیا ہے کہ اُن کو ایک

پل دور نہیں چھوڑتا -

خورسید : اگر ویسا ہی ہوتا تو وہ میری خاطری کے واسطے کچھ بھی اپنی نشانی ادھان* بھجواتا - وہ دانائی میں کچھ کم نہیں ہے -

تیسری دایا: آفرین تمہاری عقل و دانائی پر - سب نیک عورتوں کا سنگھار فقط آپ ہی ہیں - (انگوٹھی نکال کر) اے ایماندار بانو ! دیکھو تو اپنے خاوند کی یہ انگشتری - اس سے اول سے یہ نشانی بدل دی ہے - ابھی تو آپ کی خاطر تسلی ہوئی یا نہیں ؟

خورشید : (تعجب ہو کر چشموں کو لگا کر) ہاں ، یہ مبارک انگشتری اور یہ آبدار گوہر بے شک میرے خاوند کا ہے (بوسہ لیتی ہے) ، ہمیشہ ہمیں تو ان کی خوش نما انگلیوں میں جگہ رکھنا - سدا تو میری محبت کا چراغ اُن کے دل کے فانوس میں روشن رکھنا ! اے نوجوان مہربان ! جب میرا بلبلِ دل تیری محبت کے پنجرے میں قید ہے ، تب جیسے تو نچائے گا ، ایسا ناچوں گی - بھی دائیو ! چلو ! باخوشی سے تمہارے ساتھ آتی ہوں - ہزار شکر پاک پروردگار کا کہ وہ صاحب غیبِ دان ہم کو درجۂ قدیم سے زیر دیکھنے کو راضی نہیں ہے -

[ایک میانہ لاتا ہے ، اس میں خورسید بیٹھ کے منک سنہ کے محل کی طرف روانہ ہوتی ہے]

باب دوسرا

پردہ پانچواں

ملک شاہ کا دیوان خانہ

[شاہ اکیلا کھڑا ہے]

ملک شاہ : فقط زریں پوشاک پہن ، تاجِ مرصع سر پر دھر ، تختِ اوج پر بیٹھ ، ہزاروں خواصوں ، بے شمار لفروں ، زبردست لشکر ، زرنگار محل ، نقارے کی آواز اور ہر طرف سے مبارک بادی سن کر ، لوگوں کو راضی رکھنے کے لیے بادشاہی کرنے میں کچھ بڑائی نہیں ۔ یہ بادشاہی نہیں لیکن گدائی ، بلکہ راست بادشاہی وہ ہے کہ جس میں خود شاہ بے درکار ، جو چاہے سو کرے ، جس کے ایک ہی سخن پر ملک کی سلامتی اور آبادی لٹک رہے ۔ جن کی راحت کے لیے رعایا پیدا ہونا چاہیے ، نہ کہ رعیت کی راحت کے واسطے بادشاہ ہووے ۔ اپنے ملک کی تمام نازنینوں کا اکیلا وہی مالک ہونا چاہیے ۔ رعیت کی دولت اس کے خزانے میں پڑنی چاہیے ، بلکہ عالم کے باغوں کے تمام گلوں کو نثار خود اس پر ہی ہونا چاہیے ۔ وہ خداوندِ آسمان عرش میں آرس پہان' کے تخت پر بیٹھا ہے اور ان کی ستائش ہر کوئی کرتا ہے تو میں خداوندِ زمین

زمین پہ تختِ اوج پر بیٹھتا ہوں ۔ پھر میری ستائش میری رعایا کرے تو یہ راست بادشاہی ہے ۔ آج میں یہ درجۂ عالی پر پہنچا ہوں تو پھر وہ جواں خوبرو خورشید کو اپنے ہاتھ میں کیوں نہ لاؤں ؟

وزیر : (داخل ہو کر) بندہ نواز ! بڑی خوش خبری ، وہ خورشید کو لے کر آئے ہیں ۔

ملک شاہ : آفریں آفریں ! شکار ہاتھ آیا نہیں ؟ ابھی جلدی سے اس کے خاوند کو چادر کا مول اور انگشتری دے کر روانہ کر دو اور شتاب وہ ماہ پیکر کو یہاں بھجوا دو ۔ جاؤ جلدی سے بھیج دو ۔ اب صبر کی شکتی زیادہ رہی نہیں ۔

[وزیر جاتا ہے اور خورشید آتی ہے]

ملک شاہ : اے خورشیدِ زمین ! آپ کا آنا یہاں مبارک ہو ۔ جوکہ خورشیدِ آسمان سارے جہان کو اپنی روشنی سے آراستہ کرتا ہے لیکن مدت ہوئی یہ محل سرائے اس کے تیز پرتو سے نا امید تھا ، مگر جیسے ہی آپ کا مبارک قدم یہ گھر میں آ پڑا کہ یہ سیاہ ہؤا محل روشنی سے پُر ہو گیا ہے ۔

خورشید : نیک خلق شاہ ! آپ نے مجھ کم تر کو بہت سی سرفرازی دے کر میرے سر کو آسمان سات پہنچوا دیا ہے ۔ اتنی صفت مجھ مسکین کو نا سزا ہے ۔ میں آپ کی بہت مہربانی کے چنگل میں تانی جاتی ہوں کہ میرے خاوند کو حرمت و عزت بخش کے اپنی بارگاہِ جلال میں سرفراز کیا اور مجھے امیر زادی کا مرتبہ دیا ۔ اب

فرمانا کہ مجھے اپنے خاوند کے حضور لے جائیں یا
اُن کو اِدھر بلائیں ۔

ملک شاہ: خاوند ! کون سا خاوند ؟ میں تیرا خاوند اور میں
تیرا مالک ، میں تیرا حفاظت کرنے والا ، میں ہی
تیرا دھنی[۲] ۔

خورشید: (ہنس کر) مجھ غریب کی ٹھٹھولی کم تر کرو ۔ البتہ
مجھے پناہ دینے والا خاوند تو وہ (خدا) ہے ، آپ بہ‌طریق
رعایا ، میرا خاوند بہ طریق شاہ ، لیکن محبت کا خاوند ،
میرے سنسار سکھ کا خاوند تو فقط وہ سوداگر
فیروز شاہ ہے ۔

ملک شاہ: (لاڈ سے) شاہوں کو شہ دینے والی خورشید ! یہ تیری
ہنسی پر قربان جان ، تیری خوبروئی اور نیک خوئی
کا بیان زبان سے باہر ہے لیکن آپ کی زبان شیریں سے
یہ کیا سخن ! فیروز شاہ کون ؟ وہ حضور میرے ایک
غلام کے ہے ۔

خورشید: سچ ، وہ آپ بزرگوار کا غلام ہے اور میں بھی آپ کی
باندی ہوں لیکن میرا تو وہ خاوندِ حق دار ہے ۔

ملک شاہ: تُو کیا دیوانی ہے ؟ تُو میری معشوق ، میں تیرا
سچا عاشق ، تُو میرے حرم خانے کی بانو ، اب تو
تیری زندگی میرے ساتھ لکھ چکی ۔

خورشید: (ذرا چونک کے) اے شاہ ! جو بات کرنی اپنے درجے
سے دور ہے ، وہ کرنا لایق نہیں ۔ میرے خاوند کو
یہاں بلوانا ، اگر نہیں تو مجھے پیچھے روانہ کرو ۔
غیر جگہ میں پرائی عورت کو تنہا رکھنا مروت سے
دور ہے ۔

ملک شاہ : میری جان ! بن ڈھل میرے زنان خانے میں روانہ ہو ، میں تیرا خاوند ، تیرے حضور کھڑا ہوں ۔ لازم نہیں کہ وہ ایک کمینہ آدم تجھ سی شہزادی کو ہاتھ میں رکھے ۔

خورشید : (گھبرا کر) شاہ! آپ کیا بولتے ہیں ! جس نے میری خاطر اپنا مال و دولت تاراج کیا ، جس نے میرے آرام کے لیے اپنی راحت کھو دی ۔ جو میری خاطر وطن سے بدر ہوا ، اُس کو مجھ سے چھڑاونا منگتے ہو ؟ اے شاہ ! ہوش کو اپنے جگہ پر رکھو ۔ کسی دوسرے کے ہاتھ نجس ہوئی عورت کو اپنے ہاتھ میں لینا ادک شاہِ جہاں کو نا لایق اور نا مزا ہے ۔

ملک شاہ : اے دل نواز ! کون کہہ سکے تجھ سی ایک نازنین کو نجس ۔ کبھی ایک جواہر ایک مفلس کے ہاتھ چڑھا تو اِس سے اُس جواہر کو کچھ کھوٹاپن نہ لگے گی ۔ بے مول چیزیں لایقِ بادشاہ ہیں ۔ اگر وہ کوئی گدا کے پاس ہووے تو چھین لینا حلال ہے ۔ جواہرِ بے بہا کی گدا کو کیا پہچان ؟ جو چیز لایقِ جاہ ہو ، وہاں اس کو جگہ دینا مناسب ہے ۔ پھر تجھ سی ماہ رخسار پری لایقِ بادشاہ ہے ، تجھے زنان خانے میں رہ کر رنگ و راگ کرنا مبارک ہے ۔

خورشید : پارائی عورت کے سنگ پریت کرنا بہت برا ہے اور پرائی میراث پر ہاتھ ڈالنا گناہ عظیم ہے ۔ جی جاوے تک یہ بدخیال سے پرہیز رہے اور وہ صاحب غیب‌دان کو جو چیز ناپسند ہے ، اس کا ڈر رکھو ۔

ملک شاہ : اے محبوب پیاری تو کیا بولتی ہے؟ دیو اور دیوتائی لوگ

سب پرناری[٦] عورت پہ مُہت[٧] ہوگئے ہیں ، تو پھر
میں تو آدم ہوں ۔ اور کیا تجھ کو خبر نہیں کہ پرائی
میراث پر بادشاہوں کا تو حق ہی ہے ۔

خورشید : تب کیا مجھے دغا سے بلوا کر پھنسانا چاہتے ہو؟ لیکن
ایسا کبھی نہیں ہونے کا ۔ تم شاہ ہو کے لایق اپنے کے
عورت ڈھونڈو اور اس خیال باطل سے در گزر کرو ۔

ملک شاہ : میرا سارا مدار تجھ پر ہے ، میں شاہ ہوں ، اپنے واسطے
جو چاہوں گا سو کروں گا (گردن پر ہاتھ رکھنے کو
جاتا ہے) ۔

خورشید : (ہاتھ جھٹکا کر) سنبھالو ! ذرا سنبھالو ! بادشاہ کا رواج
ایسا نہ ہوگا ۔ ان کو اپنی رعیت عزیز ہے ، اپنے دل
سے رعیت اپنا فرزند ہے ، رعیت کی بیٹی اپنی بیٹی
سمان ہے ، تو پدر ہو کر اپنی بیٹی پر کون نابکار
بد نظر کرے ؟ شاہ گویا رعیت کا آئینہ ہے کہ جس
میں رعیت اپنی نیکی اور آبادی کی راہ دیکھ کر اس
موافق چلے ۔ خاک ہوجیو وہ شاہ کے سر اوپر ! جو
اپنی پاک رعایا کو بد نظر سے دیکھے ۔ کھرا بدکار
پاپی وہی شاہ کہ غیر عورتوں ، جوکہ مانند اپنی
بیٹی کے ہیں ، اس کی پاک دامنی لوٹے ۔

ملک شاہ : (غصے سے) اے بے ڈر ! چپ رہ ، میں اپنا فرض
اچھی طرح سمجھتا ہوں ، اچھ اندیشہ کر اور جلد
میرے تابع ہو ۔ ساری دنیا کی بانو ہوگی ۔ اگر نافرمان
ہوگی تو تیرا بد حال کروں گا اور تجھے بہ زور و ظلم
تابع میں لاؤں گا ۔

خورشید : (بہت غصے سے) تابع میں لائے گا ؟ اے موذی ! اے دغا خور ! اے شوخ چشم ! تو خدا کا بڑا گنہ گار ہے ، تو نے مجھے دغا سے فریفتہ کر ، یہ دوزخ خانے میں بلوایا اور اب مجھ سے اپنی بد ہوس پوری کرنے کا ارمان رکھتا ہے ۔ تو خاطر جمع رہ ، اگر میری پاک دامنی پر کچھ بھی داغ لگائی تو تیرے اوپر اپنی جان نکال ڈالوں گی اور تجھے شہر بہ شہر رسوا اور فضیحت کروں گی اور سارے جہان کے بادشاہوں میں شور مچا کر اظہار کروں گی کہ اپنی فرشتہ سی شکل میں تو شیطان ہے ، تو شیطان نے پاک تاج کو اپنے دھجیلے سر پر رکھ کر ناپاک کیا ہے ۔ تو کیا مجھے تابع کرے گا ؟

ملک شاہ : (ذرا غصے سے) اے دیوانی ، اب تک کچھ بھی سمجھ ، یہ میں آخری سخن کہتا ہوں ، اگر اس پر تو عمل نہ کرے گی تو پاک خداوند کی ، فرشتوں کی ، آسمان کی اور یہ تخت و تاج کی قسم لے کر کہتا ہوں کہ ابھی میں تیرے خاوند کو تیرے چشم حضور ذبح کراؤں گا اور تجھے قید کر بازور سے موم بناؤں گا ۔ یہاں سے کب چھوٹے گی کہ دنیا میں شور مچائے گی؟

خورشید : (اپنے دل میں) اے کم بخت خورشید ! اب تو مکار دیو کے ہاتھ پھنسی تو سہی ۔ ابھی تو مشکل کی گرہ تدبیر کے ناخن سے کھولنا چاہیے ، ورنہ اس حجت میں پیارا فیروز مارا جائے گا ۔ (ایک دم ہنس کر) اے خوش رفتار شاہ ! عبث خفا مت ہو ، اس میرے سخن کو اپنی توہین نہیں بوجھنا ۔ میرا جی آپ پر

فدا ہے ۔ میں نے تو آپ کا امتحان لیا کہ آپ مجھے
بہ شوق و صدق دل سے چاہتے ہو کہ نہیں ، کیونکہ
وہ فتح شاہ نے بے وفا ہو کر میری حرمت لی ، ویسا
آخر تم سے نہ ہووے ۔ سچ ہے کہ گوہر آبدار کے
آگے سیپ کی کیا منزلت ، تو ایک مفلس کے ساتھ
رہنے میں مجھے کیسے راحت ہو ؟ آپ جاہ و جلال سے
پور۱۰ تو میں ایک حور ۔ بے شک آپ کے لایق ۔

سالک شاہ: شاباش ، میرے دل کی امید بر آئی ۔ خوشی سے آج میں
دیوانہ ہوں ۔ آہ چھاتی میں خوشی کے دھکے پر دھکے
لگتے ہیں ۔ خوشی سے کیا یہ پھٹ جائے گی ؟ اگر
ساری دنیا کی آفت مجھ پر اترے اور اس وقت آج
گھڑی کی خوش حالی میں یاد میں لاؤں تو وہ تمام آفت
بھاگ جاوے ۔ اب امید کی عمارت بندی پوری ہوئی ۔
آرام کے درخت پر کلی پھوٹ آئی ۔ بہشت کی حوروں
کا خوش آواز میں آج سنتا ہوں ۔ اے فتنۂ روزگار !
چاند سا مکھڑا تیرا دیکھتے ہی عاشق تیرے جمال کا
ہوا ہوں ۔ تو ابھی چل میرے حرم خانے میں ، میں
آج کے آج نکاح سے پیوند کرتا ہوں ۔

خورشید: اے عزیز ! اب اتنی شتابی مت کرو ۔ میں نے آپ کی
مرضی باخوشی سے قبول رکھی ، تو چاہیے کہ تم بھی
میری خواہش بر لانا ۔ مجھے ایک قباحت ہے کہ اتنی
شتابی سے ابھی کے ابھی اپنے خاوند کو چھوڑ کے
تم نامدار کے ساتھ نکاح کروں ، تو لوگ مجھے نفرین
کریں گے ۔ میرا نام بے وفا اور بد کار عورتوں میں
لکھے گا ۔ اتنا ہی نہیں ، پر اس سوداگر بچے کی آہ سے

مجھے خطر اور تم کو ضرر ہوگی ، بلکہ اس میں کچھ
مشکلی در پیش آوےگی ۔ بہتری کے لیے میں آپ کے
پاس سے چہار ماہ کی ڈھیل مانگ لیتی ہوں ۔ اتنی
مدت مجھے یہاں سے دور رکھو کہ اتنے میں سب جرچا
کم ہوجائے گی اور میں دست مبارک اپنا گردنِ مراد
پر حائل کروں گی ۔

ملک شاہ : اے گل عذار ! تیری خواہش بہت سخت و دشوار
ہے ۔ چہار ماہ کی درازی میرے سے کیسے کٹی جاوے
گی ۔ یہ مدت مجھے بہت دل تنگ کرتی ہے ۔
لیکن :

گو ناخوشی سے میری ہوتا ہے جی ترا خوش
جس میں تری خوشی ہو میں خوش مرا خدا خوش

تو بہتر ، اپنی چھاتی اوپر سنگ رکھ ، چار ماہ کی
مدت تک میں تجھے اپنے دریائی محل میں تنہا
رکھتا ہوں ۔ وہاں رہ کر باخوشی وقت گزار ۔ میں
تیرے حضور بہت سی داسی اور دایہ رکھوں گا ۔
ان شاء اللہ تعالیٰ بعد حاصل ہونے مطلب ، جلد
پیوندِ نکاح کر ، بوستانِ وصال سے گلِ مراد چنوں گا ۔
خورشید ! اب میں جاتا ہوں اور تجھے دریائی محل
میں بھیجنے کی تدبیر کرتا ہوں ۔ ایک بوسہ دے
میری جان !

[(خورشید) ہٹ جاتی ہے (ملک شاہ چلا جاتا ہے)]

خورشید : (اکیلی ، دل‌گیر اور غصے میں) پھٹکار تجھ پر اے
رذالے غلام ! اب تُو دیکھے گا کیسے ہوئے اپنے

پاپ کا بدلہ اور ناپاک کام کا پچھتاوا ۔ اے بے مغز گدھا ! کبھی بھی آمید مت رکھنا کہ میں تیرے تابع ہوں گی ۔ خورشید کو دو چیزیں عزیز ہیں : فیروز یا موت ۔ اے خورشید ! تُو اپنے خاوند (کے) حق سے بے ایمان ہو، اپنے نام و نسب اور حسن کو کلنک لگا لے گی ؟ کبھی نہیں ۔ عالم لوگ کہتے ہیں کہ بد دیانتی اور بے ایمانی کا وجود عورت ذات سے ہے لیکن میں ثابت کروں گی کہ میں پاک دامن ذات اور نام فقط عورت رکھتی ہوں ۔

[جاتی ہے]

———

باب تیسرا

پردہ پہلا

فیض آباد میں جہاندار شاہ کا محل

[غازی خاں چور کے لباس میں ہتھیار بند داخل ہوا ہے]

غازی خاں : (اکیلا) ملک شاہ کے دربار کا ندیم غازی خاں ، اب تو میں نہیں ہوں بلکہ میں پہلے کا 'سدھاں'[1] چور بابک ۔ میں اکھنڈ گیا ، دکھن گیا ہر اب تک میرا لکھن[2] تو نہیں گیا ۔ چوری میں جتنی مجھے مزہ[3] ہوتی ہے ، اتنی کسی میں نہیں ۔ بھلوں بھلوں کے مال و اسباب میں اٹھا گیا ہوں لیکن کسی نازنین کی چوری نہ کی ہے ۔ آج میری نیک صلح میں آتا ہے کہ جہاندار شاہ کی بیٹی اس کل چھر کی انگلیوں کو جو قیمت‌دار انگشتری رونق بخشتی ہے ، اس کو جھڑپ سے اٹھا لینے کا کوئی گھاٹ[4] بنانا ۔ آج بندے نے جان پر کھیل کر بڑی ہمت کی ہے ۔ ہزاروں زبردست چوکی پہروں کی نظر چرا کے اس محل سرائے میں تو داخل ہوا ہوں لیکن میں کھرا بابک تو تب ہی کہ جو صفت سے یہاں آیا ہوں ، ویسا ہی مراد کے ساتھ نکل جاؤں ۔

[اندر خانے سے سرود کی آواز نکلتی ہے ، وہ سنتے ہی
بابک جھوک کے ایک کونے میں چھپ جاتا ہے ، پردہ
اُگھڑتا[۶] ہے اور محل کے ایک دالان میں جہاندار بادشاہ
کی گل‌چہر نام ایک بیٹی پلنگ پر سوئی ہوئی نمودار
ہوتی ہے ، جس کے نزدیک رامش گرس گانا گاتی ہیں ۔
داسیاں پنکھا ڈالتی ہیں[۷]]

رامش گریں : غزل

نیم جاں ہیں یہ ترے چشم کے بیمار کئی
مر گئے خنجرِ مژگاں کے دل افگار کئی

ـــــ نیم جاں

کوئی سسکتا ہے ، کوئی تڑپے کوئی (ہے) بےچین
آج دیکھے ترے کوچے کے گرفتار کئی

ـــــ نیم جاں

تیرے بازار میں اب کیونکہ نہ بگڑے کوئی
ایک یوسف نظر آتا ہے ، خریدار کئی

ـــــ نیم جاں

[گانے کی لہر سے شہزادی سو جاتی ہے اور سب کوئی
وہاں سے نکل جاتے ہیں[۸]]

بابک : (آہستہ سے باہر نکل کر) واہ ! برف کے مانند سفید ،
سرو کے مانند سیدھی ، گلاب کے مانند خوب رو ،
چنبیلی کے مانند خوشبودار :

عجب طرح کا حسن ہے دل‌ربا
کہ روشن ہے عالم میں مہتاب سا
یہ زلفِ سیہ سنبلِ باغِ حسن
یہ چہرہ کہ ہے نو گلِ باغِ حسن

شگفتہ یہ رخسار مانندِ گل
جسے دیکھ کر زخمی عالم ہے کل
مسی میں یہ دانتوں کا عالم عجب
پھر اس میں ہنسی ہے قیامت غضب
لبِ لعل گل‌رنگ یا قند ہے
زباں جس کی تعریف میں بند ہے

یہ حورِ آسمان باغ کی سفید کیاری پر خواب میں کیسی لیٹی ہے ۔ عدن کے باغ میں ماں حوا بھی ویسی ہی ناز سے فردوسِ خواب میں غرق ہوئی تھی اور ناپاک شیطان نے اس کے لیے تبھی بدی کا پھاسا تیار کیا تھا ۔ ہاں ایک لذت بھرا بوسہ یہ گلِ گلاب گال پہ لوں ۔ ایک ہی بوسہ ! مگر یہ جگمگاتا جواہر میرے بدبخار[۹] سے بن تیز ہوجائے گا ۔ آ ہا ہا ! کیسی معطر دار لپٹ اس کے ناز بھرے بدن سے نکلتی ہے ۔ ان کا سانس اس دالان کو شیرینی سے پُر کرتا ہے ۔ دیکھو نہ روشن چراغ بھی بانکا ہو کے اس کی آنکھوں کے چراغ کو نمن‌‌‌‌‌‌‌‌ کرتا ہے ۔ ابھی ایک ہی بغل گیری اور ایک ہی بوسہ لوں تو ساری زندگی بھر ننک پیٹ بھرا رہوں ۔ مگر نہیں اے بے وقوف بابک ! زیادہ لوبھ میں گردن اکھڑ جائے گی ۔ گپ چپ اپنا بے مول گوہر اٹھا کے ادھر سے کھڑا ہو کہ اس میں تو سیانا کہلائے گا ۔

[بابک گل‌چہر کی انگلی سے آہستہ‌آہستہ انگوٹھی نکالتا ہے ۔ اتنے میں شاہزادی پھرتی ہے ۔ اس کے ڈر سے ہاتھ چھوڑ کر (بابک) پلنگ کے نیچے بیٹھ جاتا ہے ، پھر سنبھلتا ہوا باہر نکلتا ہے اور انگوٹھی نکال، لے کے وہاں سے بھاگتا ہے]

باب تیسرا

پردہ دوسرا

سندھ کا ایک محلہ

[فیروز شاہ سر کے لباس میں]

فیروز : ظلم ! ظلم ! اے بدکار زمانہ ظلم ! افسوس میرے اقبال کی روشنی پر سیاہ پردہ نمودار ہوا ۔ آہ ! اے خورشید ! مجھے چھوڑ کہاں گئی؟ جاودان تک زندگی کی امید ٹوٹ گئی ، ظلم کے جنگل میں بھولا پڑا ، میرے اطراف میں اب سیاہ اور کانٹے دار ویرانہ پڑا ہے ۔ کہاں جاؤں ؟ کس سے کہوں ؟ کیا کروں ؟ اے بد آسمان ! تیرے گرداں کے چکر میں پھنسنے کو سارے جہاں میں سے فقط میں ہی تجھے ملا تھا؟ بادشاہی درجے سے تو نے مجھے فقیر بنا دیا ، تو بھی تو مجھ سے نہیں دھراتا ۔ کسی کو بھی خبر نہیں کہ آشکار زمانہ خورشید بیگم کا میں برگشتہ طالع خاوند ہوں ۔ خورشید ! خورشید ! تیرے لیے جاہ و جلال ، دولت و مال خدمت‌گار ، جان اور زندگی سب میں گنوائی اور تو مجھے چھوڑ کہاں گم ہو گئی؟ کیا تو بے ایمان ہوئی ؟ کیا اپنی دامن لٹائی ؟ اے جان ! تیرے مثل نرمل ،

تیرے مانند سفید تو پہاڑ پر جما ہوا برف بھی نہیں -
مہرباں خورسید : تابدار خورسید ! روشن دل خورسید !
اے خورشید ! بس خورشید !

[ماہرو سماہ پکارتا ہے اور لوگ اٹھا ہو ...
دیکھتے ہیں]

ایک راہداری: ہاوا ! کاہے کو اتنی سور ہکور کرتے ہو - آپ کے سر میں کچھ خلل ہوا ، کیا ہے ؟ خورسید تو اپنے عالم تاب تبزی سے نمودار ہے ، آج وہ اپنے پرتو سے سب کو جلا ڈالتا ہے اور آپ کاہے کو جی کھوتے ہو؟

دوسرا راہداری : (ہنس کر) نہیں نہیں ، یہ تو آفتاب کے پاس جواب چاہتا ہوگا ، کیونکہ ان کے باپ دادا کی طاب اس پر ہے ، سو آج سب کے حضور ثابت کرواتا -

فیرور : اے برادرو ! کوئی زخمی دل کی ٹھٹھولی کرنا خوب نہیں - میں ایک آزردہ دل ہوں ، میری خورشید نام جورو خدا معلوم کہاں گئی، اس کے غم میں گرفتار ہوں -

تیسرا راہداری: (اے دیوانے ! عورت گئی توکیا ماں باپ مر گئے؟ جیسا اپنی پرانی جوتی بدلتا ، ویسے ہی اس کو بھی بدل کر نئی لا ، جورو کی خاطر اتنی زاری اور غمخواری کون کرتا ہے ؟ بھلے مانس اتنی بھی عقل نہیں کہ عورت کسی کی نہ ہوئی ہے اور نہ ہووے والی ، کاہے کو عورت عورت کرتا ہے ؟

چوتھا راہداری: اے احمق ! حق تعالیٰ کا احسان مند ہو کہ وہ عورت فقط تنہا نکل گئی اور بہتر کہ تیری جان سلامت رکھ گئی - کس لیے پریسان ہوتا ہے اور عبث اپنی حرمت گنواتا ؟ جاؤ جاؤ دوسری کرو کہ سکھ پاؤ گے -

فیروز : (چڑ کر) اے بے درکار لوڈو ! یہ کیا بکواس کرتے ہو ؟ عورت کے سوا دوسری کون سی چیز راحت بخش ہے ۔ تم سریکھے[۲] آدموں کی حفاظت کرنے کے لیے حق نے ایسی خوب چہرہ بنائی ہے ، بغیر اس کے حالت تمھاری مانند حیوان کے ہوتی ، فرشتے کا آثار عورتوں پر نقش کر ، تم سے نادانوں کے حضور دھرا ہے ۔ مگر کم فہمی کے سبب اس کی خوبی سے خام رہے ہو ۔ بہشت برس میں جو جو ہستی ہے ، وہ سب عورتوں میں چتاری[۳] ہے ۔ حیرت مند تاب ، پاکیزگی ، راستی ، جاوداں تک کی خوشی اور ہمیشہ تک کی محبت سے عورت ذات پر ہے ۔ تم لوگ عورت کی صفت کہاں سے سمجھو ؟ جاؤ اپنے رستے سے چلے جاؤ ۔

تیسرا راہداری: دیکھو جی ! یہ نظروں سے ، عورت ذات پارسا کو بھی فریفتہ کرتی ہے اور سادھوؤں کی سدھ کو بسراتی ہے ، کوئی باوا تو خدا کا نام پکارتا ہے اور یہ فقیر تو عورت کا بھجن لے کر بیٹھا ہے ۔

دوسرا راہداری: نپاس[۴] رکھیو۔ یہ کاکا[۵] کوئی بنجھی تو نہ ہووے ۔ کہاں آڑا ترچھا چھاواں مار جائےگا ۔ ایسے فورتاجی[۶] بہت سے آتے ہیں ۔

فیروز : اے دل فگار خورشید ! درد بھر داغ یہ دیکھ ! پیاری تو کہاں ہوگی ؟ تیری سی وفادار، تیری سی تابع دار ، خورشید اے خورشید !

[راستے کے لڑکے خورشید خورشید پکارتے فیروز کو چڑاتے ہیں ، راہ داری ان کو نکال دیتے ہیں]

چوتھا راہداری: سادھو جی! جب آپ کی عورت پارسا اور ایمان دار
ہوتی تو آپ کو چھوڑ کر کیوں گئی؟ اگر پارسا
ہوگی تو پھر بھی پیچھے آئے گی، نہیں تو نام پر اس
کے ایک بار فوق[۸] رندھ کے خاموش بیٹھ۔ یہی رانڈوں
نے فریب سے میرے مانند کئی ایک اٹوا[۹] گئے ہیں۔
بھلے مرد! اب تک مقدر نامہ عورت تو نے پڑھا نہیں
ہے؟ جا! دیوانہ ہو جائے گا۔ خورشید خورشید پکارنا
چھوڑ دے۔ آپ یہاں زاری کرتے ہو اور بی بی صاحب
کہاں مزہ مارتی ہوگی۔

فیروز: آزردہ نہ کر دل تو مرے یار کسی کا
وقت یکساں رہتا نہیں ہر بار کسی کا (کدا)

دنیا میں مانند اس کے عورت نہیں، آدم میں اس کی
مثال خوب روئی نہیں، آسمان میں مثل اس کے پری
بھی نہیں۔

راہ داری: میاں ذرا سنبھالو، ایک دم سولی پر کیوں چڑھے
جاتے ہو، خدا تم سے پناہ رکھے۔

فیروز: اے جان! اے زندگی! اے دولت! اے خورشید!
[سر پھوڑتا ہے اور بچے مسخری کرتے ہیں]

راہ داری: مرنے دو اس کو بھائیو! اپنی راہ چلے جاؤ، اس میں
اپنے کو کیا نفع۔

[سب کوئی جاتے ہیں اور لڑکے پھر بھی
چڑا کر بھاگتے ہیں]

فیروز: دنیا کیسی دیوانی! سچی محبت کا ٹھٹھا! دکھ پر لوگ
ہنسی کرتے ہیں۔ یہ عالم بھلوں کے لیے نہیں، اس جان
کو ابھی قبض کر ڈالوں مگر اور بھی امید خورشید

ہے ، الٰہی سے نا امید ہونا بڑا گناہ ہے ۔ آفتابِ عالم تاب جیسے جہان کو نور مند کرتا ہے، ویسی جھمکتی امید ہے ، دردمند دریا کے خرابے سے بچانے کی ضرور امید ہے ، مرگ زندگی کی راہ بتانے والا ستارہ امید ہے ؟ زبردست سیاہ طوفان میں سے نکلتا احساس[10] کا ایک ہی کرن امید ہے ، تب اس امید کی چھاؤں میں میں پناہ کیوں نہ لوں ؟ امید ! امید ! جون بھی خورشید کی امید !

[آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر]

دشتِ غربت میں پڑا ہوں یا اللہ
کون مجھ کو تجھ سوا دکھلائے راہ
نا کوئی ہمدم ، نہ یاں ہمراہ ہے
ہے اگر تو (بس) جگر کی آہ ہے
کس سے درد و غم کروں اپنا بیاں
لب پہ آ پہنچی ہے جانِ ناتواں
ہر قدم پر ہیں یہاں خطرے ہزار
تو بچائے تو بچوں پروردگار !

[جاتا ہے ۔ (دوسری طرف سے) فیروز کا دوست بہادر خاں آتا ہے]

بہادر خاں : (اکیلا) بڑی مشقت و زحمت کر ، شہر بہ شہر بھٹک کے ، جمع کی ہوئی ہمہ چیزوں کے بھرے ہوئے سات جہاز ایک پلک کے بیچ اڑا کر میرا رفیق فیروز شاہ چلا گیا ۔ یہ سب کس کے لیے؟ فقط ایک عورت کے لیے ۔ مگر اس نیک مرد نے کچھ دور اندیشی نہ کی کہ کون عورتوں کی سنگتی میں سلامت رہا ہے ۔

وہ دوست میرے نے خورشید کی خریدی نہیں کی ہے بلکہ بلی'' ہوئی بلا سر لی ہے۔ جو دلربا کو دیکھتے ہی ہزاروں دیوانے اور باورے بن جاتے ہیں تو فیروز کے ہاتھ خورشید کے زیادہ وقت رہنے کا بھروسہ کم۔ زبردست حریف تو وہ نابکار، مکار اور لچا خود گو وال ہے۔ اس کا میرے صاحب کی پوچھ پاچھ کرنا اور ان کی پوشاک منگوا لینے کا سبب کچھ معلوم نہیں ہوتا ہے۔ وہ اژدہا کی مانند گپ چپ وہاں سے نکل گیا ہے، تو میں ڈرتا ہوں کہ مبادا وہ انجان میں اس کو ڈنکے" ۔ مگر نمک حلالی اور فرض گزاری کا وقت یہی ہے۔ میں بھی وہ چھپے اژدہا کے پیچھے نیولے کی مثال چلا ہوں، تو اپنے رفیق کو آگاہ کر رکھوں، یا تو سوتی کوتوال کی جان اپنے ہاتھ سے لوں۔

باب تیسرا

پردہ تیسرا

سندھ میں ملک شاہ کا دریا محل[1]

[خورسید ذاکیر جیسی جھروکے پر بیٹھی الما غم کرتی ہے اور دور سے ایک جہاز پہ ایک چور کب سے پہرا[2] بیٹھا ہے]

خورشید : چارماہ کی مدت تمام ہونے پر آئی ، اب ملک شاہ نا صبر ہوا ہے ۔ عزیز فیروز ! مہربان فیروز ! تیری بہت سی انتظاری کی مگر تیرا نشان نابود ہوا ۔ اب سارے بدن میں دہشت سے لخلخہ[3] آتا ہے ۔ ننگ و ناموس لٹانے کا وقت نزدیک اور پاک دامنی پرسیاہ داغ کا پڑنا ہو بہو آیا ہے ، بہتر کہ جان لٹا دوں ۔ یہ پاک دامنی لٹا کے پارسائی کے نام کو ناموسی نہ پہنچاؤں ، فیروز کو دیا ہوا قول ہرگز نہ توڑوں ۔ مہربان فیروز ! الماس سی چشم تیری کا تیر ہر گھڑی سیاہ مغز میرے پر روشنی پھینک ، مجھے اپنا قول یاد دلاتا ہے ۔ ارے قول میرا تو انسانی ہے ، پر محبت تیری خدائی ہے ۔ تیرے لیے جو جو بدنامیاں میں نے اپنے سرلی ہیں ، وہ تیری ایک گھڑی کی مہک سے دھوئی جاوے گی ۔

نہیں بھولتی تجھ کو اے میری جان !
کروں کیا کہ مجھ پر ہے قید گراں
پر اس قید میں بھی ترا دھیان ہے
فقط تیرے ملنے کا ارمان ہے
تو اپنی جو صورت دکھائے مجھے
تو اس قید ستم سے چھڑائے مجھے

(سود فیروز، محل کے نزدیک آ پہنچتا ہے اور نہایت سے
اس کی ندی کے کنارے پر بیٹھ کر بولتا ہے)

فیروز : میری زندگی اس ندی کے موافق ہے جیسے اس آب کی جھلک گھڑی میں جاتی ہے، ویسی میری زندگی کی خوش حالی ہوا میں اڑ جاتی ہے۔ خوش حالی کے ساتھ اس کا نرمل پانی ایک بار جھمکتا ہے تو دوسری دفعہ ہولناک دریا میں شتاب کھینچا جاتا ہے، بہار زندگی میری ذرا سی سگفتہ ہوئی، نہ ہوئی کہ ستم کے تاب سے کمھلا جاتی ہے، تب یہ زندگی کیا کام کی؟ ایسا دل درد جینا کیا بھلا؟ لیکن نہیں، زندگی کے گھر اور گھور کے بیچ زنجیر سے کیا ہوا مضبوط اترا ہے، میری قبر اور میرے بیچ خورسیا کا پردہ ہوا ہے، وہ نہیں مرنے دیتی ہے تا نہیں جیے۔

نہیں مجھ کو مرنے سے کچھ اپنے ڈر
یہ غم ہے کہ تجھ کو نہ ہووے خبر
تجھے کاش اِس وقت میں دیکھ لوں
جیوں میں اگر تیرے آگے مروں
کوئی دم کا مہماں ہوں آج کل
اسی جگہ میں جائے گا دم نکل

اے خداوند! اب تو دنیا کا تماشہ میں دیکھ چکا۔

خورشید : جب اخلاص کے مارے سے خلاصی پایا ہوا پنچھی اپنے جوڑے کے لیے جھراپا کرے، اس مثال سے رات و دن میں جھورتی ہوں۔ دلاسا اور دلیری سے کوئی امید رہی نہیں۔ فقط غم بھرا سرود ذرا سا جی بہلاتا ہے۔ اس کی شراب بار بار پی کر میں مست ہوتی ہوں۔

غزل

جدا کسی کا کسی سے کوئی حبیب نہ ہو
یہ داغ وہ ہے کہ دشمن کو بھی نصیب نہ ہو

جدا جو ہم کو کرے اس یار کے کوچے سے (کذا)
الٰہی راہ میں ایسا کوئی رقیب نہ ہو

علاج کیا کریں حکما تپِ جدائی کا
سوائے وصل کے اس کا کوئی طبیب نہ ہو

[یہ گانا فیروز دھیان سے سنتا ہے اور ناصبری بتاتا ہے]

فیروز : یہ آواز کی اثر مجھ پر کچھ اور ہوتی ہے۔ مجھ سا کوئی کم بخت غم کے غار میں غوطہ کھاتا ہے مگر ایسے سرائے بادشاہی میں غم گینی! تب میں کون بساط میں؟ ارے میں بھی ایک شاہزادہ تھا لیکن گردشی دنیا سے آج تفرگاہ[۸] ہوا ہوں۔ جب یہ جان نثار سرود نے مجھے اتنا راحت مند کیا، تب میرے حلق سے کیوں نہیں؟ یہ غم گین دل کو میں بھی خوش کروں۔

غزل

کس مزے کے رنگ سے بن بن کے آتی ہے بہار
حسن کو اپنے عجب سج سے دکھاتی ہے بہار
—— کس مزے

چاندنی ہے ، شہر ہے اور بادۂ گل رنگ ہے
گر نہیں خورشید ، کس کافر کو بھاتی ہے بہار
—— کس مزے

ماہتابی کے مزے میں ، ہائے وہ خورشید نہیں
حیف اُس کے ہجر میں کیا مفت جاتی ہے بہار
—— کس مزے

[اس گانے میں بار بار خورشید کا نام آنے سے خورشید چونکتی ہے ، کھڑکی سے جھانکتی ہے اور فیروز پر نظر پڑتی ہے]

خورشید : ارے میرے نام سے کون سرود کرتا ہے ؟ او ! آواز اور صورت تو فیروز کی ہے ، لیکن حال و احوال میں دیکھیے تو فقیر ۔

[ٹک ٹک دیکھتی ہے]

سچ ! یہ تو میرا جان فیروز — افسوس ! کیسا شکستہ بیچارے کا حال ! میرے عزیز کو دیکھتے ہی ہر کھ" سے چھاتی کیسی "اٹکتی" ہے ۔ اے بار خدایا ! آج تیری بڑی مہربانی ۔ غم خوار خورشید اٹھ ! آج خوابیدہ بخت بیدار ہوتا ہے ، کھویا ہوا گنج ملا ۔

[بانگ بلند سے فیروز کو پکارنے جاتی ۔ اٹک کے]

اوہو ، یہ تو میرے سے نادانی ہوتی ۔ ذرا صبر اختیار

کرنا خوب ۔ کوئی پنہاں توڑ[۱۲] سے میں اسے ظاہر
کروں ۔ مبادا جاتا تو نہ رہے ۔

[ادھیری ہو کر کھڑکی سے اندر جاتی ہے]

فیروز : واہ ! کیسی ٹھنڈی سی لہکی ، سب سکتی بھول جاتا
ہوں ، غم گینی بھول جاتا ہوں ، دنیا بھول جاتا
ہوں ، میری چھاتی کون سی خوش‌حالی کے دھڑاکے سے
دھڑکتی ہے ، قسمت بازی سلٹی[۱۳] ہونا مکنتی ۔ گویا
حق تعالیٰ کی مہربانی کی جھپک[۱۴] معلوم ہوتی ہے ۔

خورشید : (کھڑکی کے اندر آ کر) اے دل بند! جگہ بیوند فیروز!

[فیروز گھبرا کر اونچے دیکھتا ہے]

فیروز : (سامنے دیکھ کے چونک کر ، شتاب کھڑا ہوتا ہے) یہ
کیا ! خواب ہے یا خیال ! (جوش میں آ کر) جان من
خورشید ! روشنی بخش خورشید ! اوہو ، کیسا معجزہ !
آہا ہا ہا ! ملا ! ملا مجھے گم ہوا گوہر ملا !

خورشید : (ہاتھ کے اشارے سے) خاموش ! ذرا خاموش خاوند!
یہ وقت چرچا کا نہیں ۔

فیروز : مگر تو کدھر ہوتی پیاری ؟

[جھاڑ پر وہ غازی خاں دور جھپا بیٹھا ہے]

غازی خاں : (اپنے دل میں) واہ ! یہ دونوں کی جوڑی کہاں سے
لگ گئی ہے ۔

خورشید : عزیز ! میں فریب کے پھانسے میں پھنسی ہوئی ہوں ۔
اب زیادہ کہنے کا وقت نہیں ، ذرا سن لو ! جب آدھی رات
ہووے تب ایک تیز گھوڑا اور مردانی پوشاک لے کر

کپ حپ یہاں حاضر ہونا اور جابک کا ایک اشارہ مجھے
کرنا ، میں جھروکے سے جلد نیچے آؤں گی . ابھی تو
یہاں سے نکل جائیو ۔

فیروز : یہ بے حد خوش حالی ساری غم کینی کے پہاڑ کو اس
پاک ندی میں ڈبانی ہے ۔ اب بجلی کی لپک مانند جاکر
سب کچھ سباب تیار کروں اور میرے ہیرے" کے
ہار کو پیچھے گلے میں ڈالوں ۔ اے خداوند ! کیسی
عجیب الٹ پلٹ !

[فیروز جاتا ہے]

غازی خاں : (اپنے دل میں) بچہ غازی ! ہاتھ تو ابھی آئی ہے ازی .
کوئی فرزاح[٦] سے یہ نازنین ہاتھ آوے تو کیا خوب ۔
اج عقل آزمودہ کا دیکھوں ، کیا ہوتا ہے ۔

باب تیسرا

پردہ چوتھا

خیرپور کا ایک جنگل

[ہمایوں شاہ کے بیٹے، جو فتح شاہ کے سردار تھے اور جنھیں کوتوال نے چغلی کرکے دیس نکالا کروایا تھا ، اس میں سے ایک جہاں بخش نام کا بیٹھ کر اس دنیا کی بے وفائی پر گانا گاتا ہے]

جہاں بخش : **گانا**

گیا اخلاص عالم سے ، عجب یہ دور آیا ہے
ڈرے سب خلق ظالم سے ، عجب یہ دور آیا ہے
نہ یاروں میں رہی یاری ، نہ بھائیوں میں وفاداری
محبت اٹھ گئی ساری ، عجب یہ دور آیا ہے
بہت سے مکر جو جانے ، اسی کو سب کوئی مانے
کھرا کھوٹا نہ پہچانے ، عجب یہ دور آیا ہے
چغل کرتے پھریں چغلی، پھگل کرتے پھریں پھگلی[1]
دغل[2] کرتے پھریں دغلی ، عجب یہ دور آیا ہے
ہنرمندانِ ہرجائی پھریں در در بہ رسوائی
رجل[3] قوموں کی بینائی ، عجب یہ دور آیا ہے

دیش نکال کے بدکار سخن فقط اکیلا تیرے میں سارے جہاں کا ستم سمایا ہے ، تیرے دست سے ہم دونوں برادروں نے راج تاج ، عزت حرمت اور بزرگوار پدر

کے روشن دیدار یہ سب کچھ کھوایا ہے۔ اب جو تیری
مرضی یہاں سے منزلِ مراد پر پہنچانے کی نہ ہو تو
بہتر کہ ہم کو اب شتابی سے ہمیش کے چپ خانے
میں لے جا۔

[دوسرا بھائی جہاں گیر، فیروز کے دوست بہادر خاں کو
لے کر داخل ہوتا ہے]

جہانگیر : برادر عزیز جہاں بخش! آج تیرے واسطے کوئی نئی
اخبار لایا ہوں۔ بہت دن تک کھینچی ہوئی اسطاری
کا کچھ خلاصہ نہ بھلے مرد سے آج ملا ہے۔

جہاں بخش : واہ بہت دن سے خدا کا رحم نظر آیا۔ برادر جہانگیر!
کہاں سے آپ اسے لے آئے؟

جہانگیر : بھائی یہ کہتا ہے کہ وہ فتح شاہ جس کے خوف سے
اپن شہر بدر ہوئے ہیں، اس نے اننی لام آور خورشید
کو ظاہر بازار میں بکوا ڈالی۔

جہاں بخش : بیچ ڈالی؟ خورشید کو بازار میں بیچ ڈالی؟ یہ کیسی
عجب بات! کون سے کم بخت نے بیچی اور کون
نیک بخت لے گیا؟ نہ سچ نہیں پر کچھ افواہ ہوگی۔

بہادر خاں : نیک مرد! میں نے اپنی نظروں سے دیکھا کہ وہ
بیچی گئی، اور کسی نے نہیں پر سوداگر بچہ فیروز شاہ
نام خود میرے دوست نے لی ہے۔

جہانگیر : یہ کیسا دورِ دنیا! ایسا ہونے کا سبب خدا معلوم
کیا ہوگا؟ برادر! یہ عورت ایسی تو مشہور تھی کہ
ساری جہان اس کے دیدار دیکھنے کو انتظار رہتی
تھی۔ فتح شاہ کا بدکردار کوتوال کہ جس کے فند و
فریب سے آج اپن دیش نکال ہوئے ہیں، وہ نابکار

اُسی پر عاشق اور دیوانہ ہو رہا تھا ۔ اُس نے کچھ فتور تو نہ کیا ہوگا ؟

بہادر خاں : فتح شاہ اور وہ ناپاک کوتوال ؟ مجھے بہت تعجب ہوتا ہے کہ آپ اتنی دور درازی اور تنہائی میں ہو ، وہاں بھی فتح شاہ کی اور ظالم کوتوال کی چھپی بات کی ماہیتی[۳] رکھتے ہو ۔

جہاں بخش : اے بھلے مرد ! تجھے کیا کہیں ۔ ہمارے اس ظلم کا جھرا[۴] وہی ناپاک کوتوال کے بدکرتوت کے پہاڑ سے نکلا ہے ۔ ہم دونوں برادروں آج ایسے کنگال معلوم ہوتے ہیں لیکن جہاں جو ہمایوں شاہ کے ہم بیٹے ہیں ۔ نام دار پدر کے ساتھ کچھ ناخوش ہونے کے سبب ہم مارے غصے کے شہر سے نکل گئے اور وہ فتح شاہ کے دربار میں بجائے سردار کے رہے تھے ، اور نام داری کرکے مشہور ہوئے تھے ، لیکن زمانے کے بانکے دور سے ہمارے مرتبے اور شاہ کی مہربانی دیکھنے سے وہ حاسد کوتوال کی آنکھیں اندھی ہونے لگیں ۔ اس لیے وہ دغا خور نے شاہ کے کان میں کچھ پھونک کر شاہ کو خوفناک کیا ۔ اس نے خفا ہو کر ہم کو اپنے شہر سے یہاں آوارہ کیا ہے ۔

جہاں گیر : آہ ! اگر وہ یہاں آوے تو اس کے بد لہو کے در ایک[۹] قطرے سے اس زمین کو لالے کے مانند رنگیں کر، اپنا کینہ لوں ۔

جہاں بخش : (بہادر خاں کو) مگر بھائی ! آپ کا آنا یہاں کس واسطے ہوا ہے ؟

بہادر خاں : اے دردمندو ! جس کوتوال کی آپ فریاد کرتے ہیں ،

اس بدکردار کے ڈر سے ڈرا ہوا میں بھی اس دردسری
میں آ پڑا ہوں ۔ جس سوداگر نے خورشید کو
خریدا ہے، اس کا میں آشنا ہوں ۔ اس کے مال و اسباب
کے ساتھ میں پیچھے رہ گیا تھا ۔ مجھے اس رذیل
کوتوال نے پکڑ لیا اور دھمکا پھسلا کے فیروز شاہ
کی باندی مجھ سے لے کر وہ بھی چھپا دیجیے اس کے
نکل گیا ہے ۔ اس لیے مجھے فکر ہوئی ہے کہ مبادا وہ
بد کردار اچانک میرے دوست کو ٹھار کر خورشید
کو لے جائے ۔ (اس) واسطے میں بھی اس کی تلاش
میں رات و دن دوڑتا ہوں ۔ مجھے بہت سی بھک چڑھی
ہے ، میں بھوکا ہوں ، مارے پیاس کے دم بند ہو
جاتا ہے ۔ اب میرے سے کھڑا رہا نہیں جاتا ۔ میرا جی
پھرتا[۹] ہے ۔

[بہادر خاں گر پڑتا ہے اور دونوں بھائی اس کو تھام
لیتے ہیں]

جہانگیر : بھائی ! اسے اپنے مقام لے جائیں اور خوراک دے کر
آسودہ بنائیں ۔ دیکھو نمک حلالی کی کیسی نشانی اس
کے چہرے کی زردی سے معلوم ہوتی ہے ۔ ایمان داری
کا سچا نمونہ تو آج اپن نے یہی دیکھا ۔

[دونوں بھائی اسے اٹھا کر لے جاتے ہیں]

باب تیسرا

پردہ پانچواں

ملک شاہ کا دریا محل

[فیروز شاہ محل کے نزدیک ندی کے کنارے پر خواب میں پڑا ہے، نزدیک میں کپڑے کی گٹھڑی رکھی ہے اور بازو میں گھوڑا کھڑا ہے۔ خورشید محل کے جھروکے پر آ کر]

خورشید : گیارھواں پہر ہو گیا ہے، اب میرا دلدار آ پہنچے گا۔ آہ کتنی نا صبری! کتنی ادھیری[1]، جیسی نا صبری بھری سمن‌گان کے محل میں تہمینہ بانو رستم کی آرزو مند کھڑی تھی۔ جیسی انتظاری سے مصر کے باغ میں یوسف کو دیکھنے کے لیے زلیخا کھڑی تھی۔ جیسا گھبراہٹ میں راون راجا کے پنجے میں پھنسی ہوئی سیتا سندری رام کی راہ دیکھ رہی تھی، ویسی ہی آج میں بھی ناصبر کھڑی ہوں۔ یا خدا! اس میں مجھے فتح بخشیو!

غازی خاں : (جھاڑ اوپر سے اتر کر) کیسی اچھی تال بیٹھ گئی ہے۔ پکایا ہوا لقمہ تیار ہے، بِن محنت سے کھا جانے میں کیسی مزہ لگے گی۔ یہ سوداگر بچہ سویا ہے، اتنے میں محل کی کھڑکی پر کھڑی ہوئی شہزادی کو پڑا[2] لے جانے کی خوب تک[3] ہے۔ ایک اشارے پر سب آدھار[4]

ہے ۔ میں کہاں ڈرتا ہوں نہ چابک کی آواز سے چتانے
کی انھوں نے مشورت کی ہے ۔ رات اندھیری ہے اور
اوپر کا جواہر بھاری ہے ، پھر تو ہاتھ مار جانے کی
یہ کھلی باری ہے ۔ مگر ذرا صبر (سودا کر کے نزدیک
جا کر اس کی تپاس کرکے) کچھ مکر میں ، بے چارہ
آنندی میں اتنا حوش ہوگیا ہے کہ نہ اپنی خبر کہ
نہ دنیا کی ۔ برادر ! رحم کر کے فجر تک سو رہنا ۔
اے ورکھ ! تو سب ہی خواب میں ڈھونڈا ہے ۔

[دور چابک بجاتا ہے ، شتاب خورشید جھروکے پر سیڑھی
لگا کے مرن کے نیچے اتر آتی ہے اور اسے جلد سے گھوڑے
پر بٹھا کے کپڑے کی گٹھڑی ساتھ لے اپنی بھی نکل
جاتا ہے]

فیروز : (آدھی او نگھ میں) خورسید ! تو اتنی مدت تک کس
طرح سے بغیر میرے اکیلی رہی؟ عجیب تیری دھیرج ،
مگر جان من ! کچھ فکر — (بیدار ہو کر) یہ خواب
مجھے کتنا بیزار کرتا ہے ۔ بارہ بج گیا ہوگا ۔ ابھی پیاری
خورشید اترے گی ، نشان کے لیے چابک تو پھوڑوں ۔
(اٹھ کر دیکھتا ہے ، چابک اور گھوڑا نہیں ہے) ۔
ارے ! یہ کیا ؟ گھوڑا بھاگ گیا یا خورشید اکیلی
نکل گئی؟ (آگے پیچھے دیکھتا ہے) چابک بھی نہیں !
گٹھڑی بھی نہیں ! یا خدا ! پھر کچھ مہکان آئی ، نئے
سوے خانہ خراب ہوا ۔ نہیں گھوڑا کہ نہیں گٹھڑی ۔
یہ سیڑھی رکھی ہے ، تو معلوم ہوتا ہے کہ خورشید
کو کوئی چھٹکا[8] گیا ۔ اب میں موا ، موا ! (سر کوٹتا

ہے) او بد خواب ! تو نے میرا ستیاناس کیا ، تو نے میرا جواہر لٹا دیا ۔ او خورشید ! ذرا بول کیا ہوا ؟ کس نے تیرے ساتھ دغا کی ؟ (طمانچہ مار کر) صد ہزار حیف مجھ پر ، جل جاؤ یہ زندگی ! آہا خورشید پھر گئی ؟ میرا جواہر گیا ؟ دولت گئی ؟ لیکن اے موت ! تو بھی گیا ؟ ارے تو اپنا دل پسند چہرہ بتا اور دے اپنی ٹھنڈی بغل میں مجھے آرام ۔ پھر یہ گریبان چاک ہوتا ہے ، پھر درد کے دریا میں گرتا ہوں ، پھر غمخواری کے غار میں غوطہ مارتا ہوں ۔ خورشید ! اب کہاں پھروں؟ تجھے کہاں ڈھونڈوں ؟ اب کہاں اپنی جان برباد کروں ؟

[گھبرا کر ہر طرف دوڑتا ہے اور ڈھونڈتا (ہوا) جاتا ہے ۔ (دوسری طرف سے) دو دایائیں آتی ہیں]

ایک دایا : ارے ارے ! جی کی مانند جتن سے اس کو رکھی تھی ۔ خورشید نے بڑی غفلتی(د) کھلائی ۔ بہن ! اب کرنا کیا ؟

دوسری دایا : سب جگہ ڈھونڈ ماری لیکن خورشید کا تو نام و نشان نابود ہو گیا ہے ۔ کس کو خبر کب نکل گئی ، کہاں نکل گئی ، شاہ ملک کے پاس ہرکارہ خبر لے کر دوڑا ہے ، وہ تو باگھ کی مانند کینہ بھرا ابھی آ پہنچے گا اور مارے غصے کے خدا جانے اپن پر کیسی ستم گزاری کرے گا (فکر کرتی ہے) ۔

ایک دایا : اررر ! کم بختی دیکھو ، وہ دیوانے کی مثال دوڑا آتا ہے ، اب . . . . (گھبرا جاتی ہے) ۔

[ملک شاہ ، وزیر ، امراؤں ، نفروں داخل ہوتے ہیں]

ملک شاہ : (بڑے غصے میں) کہاں گئی خورشید! اتنی رکھوالی ساتھ کون کھینچ لے گیا؟ وزیر! یہ کتنی بے درکاری؟ کتنی شرمساری؟ امیرو! یہ کتنا اندھیر؟ ناپاک داباؤ! یہ کتنی ناموسی؟ اب کہو، جس پرندے کو میں نے تمھاری حفاظت میں دیا تھا، اسے کدھر اڑا دیا؟ کبھی بھی پتا بتاؤ، نہیں تو تمھارا سر دھڑ سے اکھاڑ دوں گا۔ اس میں تمھاری طرف سے کچھ بڑی دغا اور کچھ بھی فریب ہوا ہے۔ اگر تم اپنی زندگی چاہتی ہو تو میرے چور کو لاحاضر کرو۔ ارے تمھارا خانہ خراب ہووے! میری زندگی کا تکیہ توڑ ڈالا، میری امید کا شیشہ پھوڑ ڈالا! یہ جان مجھے بوجھ ہوا ہے، وہ کبھی اٹھایا نہ جاوے گا۔ شرم ہے، حیف ہے، لعنت ہے، تھو ہے۔ میری حکومت میں ایسی بیدادی! سبھوں کو ٹھگا کے سیڑھی رکھ با ہمت وہ چلی گئی اور تم نے کچھ دیکھا نہیں۔ بس جل جاؤ یہ راج تاج! جل جاؤ یہ مال و محل! پڑے وبا اس پایۂ تخت پر! سارے شہر کا ہو جائے ستیاناس! (تاج پھینک دے کر) توڑ پھوڑ ڈالو یہ نحس تاج! سب جلا کر، میں فقیر ہو کر، سارے جہان میں خورشید کو ڈھونڈوں گا۔ اے خوبرو ٹھگاری! تو کہاں گئی؟ جب تک قالب میں جان ہے، تب تک تیرا پیچھا نہ چھوڑوں گا۔

[چلا جاتا ہے]

باب تیسرا

پردہ چھٹنا

خیرپور شہر کے باہر ایک باغ

[عازی خاں حور سرجھکا ، اپنا منہ جھپا کر کھڑا ہے ، اس کے حضور خورسید عاجزی اور منت کرتی ہے]

خورشید : میرے جان کا آدھار ! میرے سر کا چھایا دار ، میری چشموں کا کشکا ! مہربان فیروز! اتنا کس لیے غصے؟ آپ نے بہت سی رنج و زحمت کھینچ مجھے بندی خانے سے چھڑائی اور پھر آزردہ رہنے کا سبب کیا ہے ؟ میرے ساتھ ایک سخن بھی نکالتا نہیں ؟ پیارے! کیا آپ سمجھتے ہو کہ میں نے اپنی دامن لٹائی یا میں باخوشی نکل گئی ؟ کبھی اس جان کو ختم کر ڈالوں پر ایسا ذرا بھی سخن تیرے کان پر آنے نہ دوں ۔ اس میں میری کچھ تقصیر نہیں ہے ۔ وہ ناپاک ملک شاہ نے فریب سے مجھے قید ، دغا سے تجھے تباہ کیا تھا ۔ میرے نام دار سردار ! آج تین ماہ ہوئے ، تیرے ہجر کے مارے جل جاتی ہوں ۔ اب تیری محبت بھری زبان کے امرت جھرے سے آرام دے ، ذرا راہِ رحم سے منہ کھول کے مجھے کہہ ، میری کیا تقصیر ہوئی ہے؟

عزیز فیروز ! ذرا دیکھ تو سہی ، میں تیری ہی
خورشید یا کوئی دوسری ؟ (زور سے چور کا ہاتھ اس
کے منہ پر سے کھسیڑ کے غیر مرد کو دیکھ گھبرا
ہو کر) ارے تو کون ہے ؟ مجھے یہاں کس واسطے
لے آیا ؟ میں نے تو اپنا خاوند فیروز سمجھ کے اتنی
بکواس کی ۔ وہ میرا خاوند کدھر ہے ؟ اے لعنتی !
مجھ پر یہ کیا جفا لایا ؟ کیا اسی بد دیانتی کے لیے
اب تک سے تو اپنا کالا منہ نہیں بتاتا تھا ؟ اے
بدکردار ٹھگ ! اس لیے اپنی پلید زبان بند کی تھی؟
اے بدکار ! تو اپنے واسطے نیک خواہ ہو تو ابھی
کے ابھی جہاں سے لے کر آیا ہے ، وہاں مجھے پہنچا ،
نہیں تو یہ جان نکال ڈالتی ہوں ، یہ چشمیں پھوڑ
ڈالتی ہوں ، یہ گلا پھانسے سے قبض کرتی ہوں ۔
اے نا پاک چور! تجھے ایسا کالا کرم کرنے میں کچھ
بھی شرم نہ آئی ؟

غازی خاں : (دو زانو بیٹھ کر) اے زمانے میں آشکار، نیک کردار
بانو ! سچ ہے کہ میں چور ہوں ، راست ہے کہ میں
نے آپ کو ٹھگا اور لعنت مجھ پر کہ میں نے آپ کو
پھنسائی ، لیکن وہ تمام نفرین ، شرم اور لعنت ، تمھاری
پاکیزہ محبت کے لیے میں صبر سے اختیار کروں گا ۔

خورشید : اے دیوانے ! تو نے کیا مجھے بازار میں بیٹھنے والی
بے شرم قحبہ دیکھی؟ کیا مانند تیرے ایک مفلس اور
بد گوہر چور کے لیے حق تعالٰی نے مجھے بنائی ؟ احمق !
جو کوئی بادشاہی محل میں چین سے نہ رہی تو تیری
کنگال جھونپڑی میں آرام پاوے گی ؟

غازی خاں : نامِ دار خاتون ! خوبی اور خوب صورتی کا سرود ہی
غریب چھونپڑے سے میرے پاکیزہ پیار کا نرمل
پھوارا چھوٹ کر آپ کو راحت و آرام کے آب سے
بھگا دے گا اور جب میرا جگر و جان آپ سے کم تر
گنتا ہوں ، تو تمام حاجتیں آپ کی مرضی کے موافق
حضور کیوں نہ دھروں گا ؟

خورشید : بے وقوف! زیادہ کہنے کی یہ جگہ نہیں ۔ اتنا ہی بس
کہ اب کیے ہوئے کی پشیمانی کر ، پیچھے ہٹ !

غازی خاں : خاطری سے جان پیاری کہ میں آخری جان پر آیا
ہوں ۔ تجھ سی نادر چیز ہاتھ آئی میں کبھی دوسرے
کے ہاتھ جانے تو نہ دوں گا ۔ اگر تو نہ سمجھے گی تو
یہ خنجر سے اول تجھے بےجان کر ، تیرے اوپر میں
بھی اپنا جی نثار کروں گا ۔

خورشید : (دل میں) اب پھنسی تو سہی ، یہ بڑا بے وقوف ہے ،
تو اس کو مکاری عورت کی کچھ صفت سے فریب کے
جال میں پھنسا کر ، اپنے جی اور پاک دامنی بچانے کا
یہی وقت ہے ۔

غازی خاں : جان ! اب اندیشہ کیا کرتی ہو ؟ چلو میرے ساتھ
میرے گھر میں اور دیکھ لو آپ کو زرِ نگار محل میں
بٹھا کے دنیا کی تمام خاتونوں کو حسد کی آگ سے کیسا
جلاتا ہوں ۔

خورشید : خیر جو ہونے کا تھا ، سو ہوا لیکن شیر کے پھنسے
سے بہتر شکاری کے ہاتھ میں جانا ۔ تیرے غریب خانے
میں رہنا بہتر ، پر وہ ناپاک ملک شاہ کے حرموں کے
بندی خانے میں جانا برا ہے ۔ چل میں تیرے ساتھ

رہنے میں راضی ہوں ۔ مگر تو میری راحت و آرام
پر نگاہ رکھیو اور مجھے کچھ درد و غم مت پہنچائیو ۔
تو بھی نوجوان اور خوبرو ہے اور میں بھی ویسی
ہوں ۔ تو پھر عمر بھر خوشی کے ساتھ ایک گوشے
میں کٹ جائے گی ۔

غازی خاں : آفرین آپ کی ہمت و دانائی پر، آج تو نے مجھے بہشت
بریں میں پہنچا دیا ۔ جان! بے فکر رہ ، تیرے ایک بال
کو بھی میں ضرر پہنچنے نہ دوں گا ۔ تجھے امن چمن
میں رکھوں گا ۔ اب تو چل عزیز! میرے ساتھ شہر
میں چل ، تجھے دیکھ ماں باپ اور سب خویشاوند
خوش خوش ہو جاویں گے ۔

خورشید : نیک بخت ! تیرے ساتھ شہر میں چلے آنے سے مجھے
بہت شرم آتی ہے ، خویشاوند اور لوگ ایک آواز سے
کہیں گے کہ میں کوئی بدکار رنڈی ہوں کہ بن نکاح
کے نکل آئی ، پھر میری عزت کیا رہے گی ؟ بہتر تو
یہ ہے کہ تو شتاب اپنے شہر میں جا اور اول اپنے
خویشاوند کو آگاہ کر اور بڑی سی مجلس لے کے دوڑ
دمام اور ڈھول نقارے کے ساتھ دولہا بن کے مجھے
بلوانے کو یہاں آ ۔ اتنے میں میں بھی بن ٹھن تیار ہوتی
ہوں ۔ اور آخر باجتے گاجتے باخوشی کے ساتھ شہر میں
جاویں ۔ پھر میں تیری حقدار عورت کہلاؤں گی ۔
مگر جلدی سے پیچھے آئیو ۔ میں یہاں اکیلی چھوڑ
رہوں گی ۔

غازی خاں : (خوش ہوکر) یا اللہ ! مجھ غریب پر تیری اتنی
مہربانی ! (خورشید سے) اے دل نواز ! تیرا مجھ پہ

کتنا احسان ۔ آپ نے مجھے کم درجے سے بلندی پر چڑھا کر سکھ باسی بنا دیا ۔ آج دنیا میں میرے موافق قسمت دار کوئی بھی نہ ہوگا ۔ جگ من! لے (ہاتھ سے انگوٹھی نکال کر دیتا ہے) یہ انگشتری میری محبت کی نشان بہ‌دل اپنی چاندی سی انگلی میں ڈال ۔ اے دلربا! یہ انگشتری بے مول ہے ، اب تک وہ جہاں‌دار شاہ کی بیٹی گل چہر کے دست کو رونق بخش تھی ۔ مگر میرے ہاتھ میں یہ کس طرح سے آئی ہے؟ سو میں تم کو پیچھے سے کہوں گا ۔ اب میں رخصت لیتا ہوں ، غیر حاضری میں آزردہ مت رہیو جان !

[جاتا ہے]

خورشید : (پیچھے سے ہاتھ کرکے) آخر چور کے پوٹلے ڈھول کی ڈھول ، بددیانتی چور! ایسا تو اندھا بن گیا ہے کہ عقل کے ساتھ یہ بے مول جواہر کھودیا ہے ۔ ناپاک! تیری سزا اس سے بہتر تو نہیں ، اب یہاں کھڑے رہنے میں سلامتی نہیں ہے ۔ یا الٰہی اے خلق کے خداوند! اب بہت ہوا مجھ دل فگار پر ، ابھی تو کچھ رحم کرکے مجھے حادثوں سے چھڑا ۔ فیروز! فیروز! تیرے لیے کس کس طرح کا فند و فریب ہوتا ہے پر کچھ فکر نہیں جان! امید رکھ ، امید سے آخر اپنی قسمت کا پانسا ، پھر دلاسے کے دالان میں اپن کو راہ دیوے گا ۔

[جاتی ہے]

باب چوتھا

پردہ پہلا

غمرپور میں جنگل

[کوتوال فیروز شاہ کے لباس میں داخل ہوتا ہے]

کوتوال : گھر و گھر اور شہر و شہر بھٹکا مگر اب تک وہ بدخواہ فیروز شاہ ملا نہیں ۔ وہ ناپاک نفر نے مجھے ٹھکایا تو نہ ہوگا ، لیکن اب تک ایک آخری جگہ تلاش کے لیے باقی رہی ہے ، وہاں جانے کی راہ بھی یہی ہے ۔ واہ ! اس کا لباس میرے بدن میں کیسا درست آیا ہے ۔ جب اس کا لباس مجھے درست ہے، تو پھر اس کی عورت بھی مجھے کیوں نہ درست آوے ۔ ایک باری دیکھتا ہوں تو اس کے موافق میرا قد و قامت ہے ، گھاٹ[1] گھٹم بھی اس کے مثال ہے ۔ بلکہ جوانی بھی اس سے زیادہ ، دولت میں زیادہ ، جاہ و جلال میں زیادہ ، حسب و نسب میں زیادہ ، اور مردان مرد ہوں ۔ لیکن اتنی سرسائی[2] کے ساتھ بھی وہ غرور خورشید مجھے چھوڑ دے کے اسی کو پکڑ رہی ہے ۔ مجھ پر کراہت اور اس پر چاہ ! کچھ فکر نہیں ، اس شمشیر کے نزدیک آدمیت کیا بساط رکھتی ہے ۔ مجھ

فیروز جو گھڑی جاتی ہے ، اس میں تیرا سر اُڑ جائے گا ، تیری پیاری لٹ جائے گی بلکہ تیری مہردار یار اپنی دامن میرے ہاتھ میں دے گی - ارے ! میں نے بھلے بڑوں کو مات اور سینکڑوں کی گھاٹ کر ڈالی ہے اور وہ فتح شاہ کے دو حاسد جوان سرداروں کو پل بھر میں میں نے موم بنا کے جہان سے نابود کروا دیا ہے ، تو پھر فیروز کیا حساب میں ہے ؟

[جہاں بخش پیچھے سے داخل ہوکر ، کوتوال جو بولا سو سن کر]

جہاں بخش : فتح شاہ کے مغرور سردار ! یہ سخن ہم بھائیوں کے لیے نہ ہو گا ؟ (سنبھل کر دیکھتا ہے) یہ تو میری پہچان کا معلوم ہوتا ہے - کون ؟ وہ بدکار کوتوال ! ہاں ہاں یہ وہی ناپاک ہے ! اے چھپا ہوا کینہ اُٹھ ! ابھی شتاب اُٹھ ! اپنے پاؤں سے چل کے شکار پھانس میں آ پھنسا ہے لیکن اول میرے برادر کو یہاں بلا کے اس کی نظر پاس بدلہ لوں کہ اس کا بھی ارمان پورا ہووے -

[وہ جاتا ہے ، اتنے میں کوتوال کی نظر اس پر پڑتی ہے]

کوتوال : صبر ! اے چور ! کدھر بھاگتا ہے؟ تو کون حرامزادہ ہے اور کس لیے بھاگتا ہے ؟

جہاں بخش : اے موذی ! زبان کو تھام رکھ ، اگر نہیں تر ابھی کاٹ لوں گا -

کوتوال : تُو جور ہے یا پنڈھارا ؟ شتاب میرے تابع ہو ، نہیں
تو ابھی جان سے جائے گا ۔

جہاں بخش : کس کے تابع ہووے ؟ تُو نامرد کے ؟ تجھ
ترکٹ باز[۳] کے ؟ اے ناپاک دیو ! یہ ایک ہی ہاتھ
تیری پلید جان کو تابع کرنے کے لیے کافی ہے ، تُو
کون ہے کہ میں تیرے تابع ہوں ؟

کوتوال : تُو مجھے پہچانتا نہیں کہ میں کون ہوں؟ اے جنگلی !

جہاں بخش : جنگلی ! اے خونی ؟ اے لعنتی ! اس جنگل میں
کوے بہت بستے ہیں مگر آج تک سوائے تیرے مور
کے پیچھے میں کسی بھی کوے کو میں نے دیکھا
نہیں ۔ اے بد کوے ! جنگل کے باگھ کے سامنے تو
ایک پل بھی ٹکے گا نہیں ۔

کوتوال : اے احمق ! اب تک تُو نے مجھے نہیں پہچانا ؟ جب
پہچانے گا ، تب تیرے سارے بدن میں کنباری[۴] چھٹے
گی ۔ سن ! میں فتح شاہ کا نام آور کوتوال ظفرخاں ہوں ۔

جہاں بخش : کس سے کنباری لرزہ چھٹے گی ؟ کیا تجھ سی لومڑی
سے ؟ اے بے وقوف ! تُو اژدہا ، بچھو یا مگرمچھ کی
صورت میں بدل جائے ، تب بھی میں تُو ناپاک زادے
سے نہ ڈروں ۔ اے موذی ! یہ سن اور جینے کی امید
چھوڑ ۔ میں تجھے آگاہ کرتا ہوں کہ فتح شاہ کی بارگاہ
کا وہ جوان مرد جہاں بخش خود میں ہوں ۔ سبب
سے تیری بدکاری اور چغلیوں کے ، آج ہم دونوں
برادروں اس جنگل بیابان میں آ پڑے ہوئے ہیں ۔ چل
اب شتابی کر ! موت کی صحبت[۵] ! میں تجھے نشٹا کر کینے
سے اپنا سینہ پاک کرتا ہوں ۔

[جہاں بخش کا نام سن کے کوتوال گھبرا جاتا ہے مگر
شرم کے لیے دھام دھوم سے تلوار نکالتا ہے اور دونوں
اڑتے لڑتے اندر جاتے ہیں - جہاں گیر اور بہادر خاں
داخل ہوتے ہیں]

بہادر خاں : اے قدرت! تو یہ بادشاہ زادے میں چھپی ہوئی ہے؟
مگر اس چہرے کے اجالے سے تو فوراً ظاہر ہو جاتی
ہے (جہانگیر سے[٦]) - اے شہزادے! آپ کا مقام
رنگا رنگ گلوں سے بھرے ہوئے باغ بہار میں لایق
تھے- وہ چھوڑ کر کس لیے اس خاردار جنگل میں زندگی
ختم کرتے ہو؟ یہاں آبدار گوہر پڑے ہیں لیکن آج
اس کی خوبی پہچاننے والا ، اس کی قدر بوجھنے والا اور
اس سے نفع لینے والا یہاں کوئی نہیں ہے -

جہانگیر : بھلے مرد! ہمارے واسطے تیری دلسوزی دیکھ ، ہم
دونوں برادر تیرے احسان مند ہوتے ہیں - کیا علاج
جب قسمت کا چرخہ الٹا پھرے ، تب حرمت ، عزت ،
حسب و نسب ، گنج و دولت ، سب انسان کو چھوڑ
جاتا ہے - ہم لوگوں تو بہت بھی چاہتے ہیں کہ اپنے
بزرگوار پدر شاہ ہمایوں کی با مدت سے قدم بوسی کریں
اور ان کی نابود ہوئی امید کو تازگی سے بھریں
مگر لاعلاج کہ جنگل کے اطرافوں ہمارے نکلنے کے
لیے بند کیے ہیں - کیونکہ وہ فتح شاہ نے یہاں ہم کو
دیش نکال کروایا ہے ، کبھی بستی میں ہم کو دیکھے
تو جان سے مارنے کا حکم کیا ہے -

بہادر خاں : سورے سردارو! آج کا روز تمھاری مہمانداری کے لیے
ہے اور میرے صاحب طرف تمھاری محبت کے لیے

کے روشن دیدار یہ سب کچھ گنوادا ہے۔ اب جو تیری
مرضی یہاں سے منزلِ مراد پر پہنچانے کی نہ ہو تو
بہتر کہ ہم کو اب شتابی سے ہمیش کے چپ خانے
میں لے جا۔

[دوسرا بھائی جہاں گیر، فیروز کے دوست بہادر خاں کو
لے کر داخل ہوتا ہے]

جہانگیر : برادر عزیز جہاں بخش! آج تیرے واسطے کوئی نئی
اخبار لایا ہوں۔ بہت دن تک کھینچی ہوئی انتظاری
کا کچھ خلاصہ یہ بھلے مرد سے آج ملا ہے۔

جہاں بخش : واہ بہت دن سے خدا کا رحم نظر آیا۔ برادر جہانگیر!
کہاں سے آپ اسے لے آئے؟

جہانگیر : بھائی یہ کہتا ہے کہ وہ فتح شاہ جس کے خوف سے
اپن شہر بدر ہوئے ہیں، اس نے اسی لام اور خورشید
کو ظاہر بازار میں بِچوا ڈالی۔

جہاں بخش : بیچ ڈالی؟ خورشید کو بازار میں بیچ ڈالی؟ یہ کیسی
عجب بات! کون سے کم بخت نے بیچی اور کون
نیک بخت لے گیا؟ یہ سچ نہیں پر کچھ افواہ ہوگی۔

بہادر خاں : نیک مرد! میں نے اپنی نظروں سے دیکھا کہ وہ
بیچی گئی، اور کسی نے نہیں پر سوداگر بچہ فیروز شاہ
نام خود میرے دوست نے لی ہے۔

جہانگیر : یہ کیسا دورِ دنیا! ایسا ہونے کا سبب خدا معلوم
کیا ہوگا؟ برادر! یہ عورت ایسی تو مشہور تھی کہ
ساری جہان اس کے دیدار دیکھنے کو انتظار رہتی
تھی۔ فتح شاہ کا بدکردار کوتوال کہ جس کے فند و
فریب سے آج اپن دیش نکال ہوئے ہیں، وہ لاچار

اُسی پر عاشق اور دیوانہ ہو رہا تھا ۔ اُس نے کچھ فتور تو نہ کیا ہوگا ؟

بہادر خاں : فتح شاہ اور وہ ناپاک کوتوال ؟ مجھے بہت تعجب ہوتا ہے کہ آپ اتنی دور درازی اور تنہائی میں ہو ، وہاں بھی فتح شاہ کی اور ظالم کوتوال کی چھپی بات کی ماہیتی؟ رکھتے ہو ۔

جہاں بخش : اے بھلے مرد ! تجھے کیا کہیں ۔ ہمارے اس ظلم کا جھرا؟ وہی ناپاک کوتوال کے بدکرتوت کے پہاڑ سے نکلا ہے ۔ ہم دونوں برادروں آج ایسے کنگال معلوم ہوتے ہیں لیکن جہاں ُجو ہمایوں شاہ کے ہم بیٹے ہیں ۔ نام دار پدر کے ساتھ کجھ ناخوش ہونے کے سبب ہم مارے غصے کے شہر سے نکل گئے اور وہ فتح شاہ کے دربار میں بجائے سردار کے رہے تھے ، اور نام داری کرکے مشہور ہوئے تھے ، لیکن زمانے کے بانکے دور سے ہمارے مرتبےاور شاہ کی مہربانی دیکھنے سے وہ حاسد کوتوال کی آنکھیں اندھی ہونے لگیں ۔ اس لیے وہ دغا خور نے شاہ کے کان میں کچھ پھونک کر شاہ کو خوفناک کیا ۔ اس نے خفا ہو کر ہم کو اپنے شہر سے یہاں آوارہ کیا ہے ۔

جہاں گیر : آہ ! اگر وہ یہاں آوے تو اس کے بد لہو کے در ایک؟ قطرے سے اس زمین کو لالے کے مانند رنگیں کر، اپنا کینہ لوں ۔

جہاں بخش : (بہادرؔ خاں کو) مگر بھائی ! آپ کا آنا یہاں کس واسطے ہوا ہے ؟

بہادر خاں : اے دردمندو ! جس کوتوال کی آپ فریاد کرتے ہیں ،

اس بدکردار کے ڈر سے ڈرا ہوا میں بھی اس درد سری میں آ پڑا ہوں ۔ جس سوداگر نے خورشید کو خریدا ہے ، اس کا میں آشنا ہوں ۔ اس کے مال و اسباب کے ساتھ میں پیچھے رہ گیا تھا ۔ مجھے اس رذیل کوتوال نے پکڑ لیا اور دھمکا پھسلا کے فیروز شاہ کی باتیں مجھ سے لے کر وہ بھی چپکا پیچھے اس کے نکل گیا ہے ۔ اس لیے مجھے فکر ہوئی ہے کہ مبادا وہ بد کردار اچانک میرے دوست کو مار کر خورشید کو لے جائے ۔ (اس) واسطے میں بھی اس کی تلاش میں رات و دن دوڑتا ہوں ۔ مجھے بہت سی بھوک چڑھی ہے ، میں بھوکا ہوں ، مارے پیاس کے دم بند ہو جاتا ہے ۔ اب میرے سے کھڑا رہا نہیں جاتا ۔ میرا جی پھرتا[۹] ہے ۔

[بہادر خاں گر پڑتا ہے اور دونوں بھائی اس کو تھام لیتے ہیں]

جہانگیر : بھائی ! اسے اپنے مقام لے جائیں اور خوراک دے کر آسودہ بنائیں ۔ دیکھو نمک حلالی کی کیسی نشانی اس کے چہرے کی زردی سے معلوم ہوتی ہے ۔ ایمان داری کا سچا نمونہ تو آج اپن نے یہی دیکھا ۔

[دونوں بھائی اسے اٹھا کر لے جاتے ہیں]

باب تیسرا

پردہ پانچواں

منک شاہ کا دریا محل

[فیروز ساہ محل کے نزدیک ندی کے کنارے پر خواب میں پڑا ہے، نزدیک میں کپڑے کی گٹھڑی رکھی ہے اور بازو میں گھوڑا کھڑا ہے۔ خورسید محل کے جھروکے پر آ کر]

خورشید : گیارھواں پہر ہو گیا ہے، اب میرا دلدار آ پہنچے گا۔ آہ کتنی نا صبری! کتنی ادھیری[1]، جیسی نا صبری بھری سمن‌گان کے محل میں تھمینہ بانو رستم کی آرزو مند کھڑی تھی۔ جیسی انتظاری سے مصر کے باغ میں یوسف کو دیکھنے کے لیے زلیخا کھڑی تھی۔ جیسا گھبراہٹ میں راون راجا کے پنجرے میں پھنسی ہوئی سیتا سندری رام کی راہ دیکھ رہی تھی، ویسی ہی آج میں بھی ناصبر کھڑی ہوں۔ یا خدا! اس میں مجھے فتح بخشیو!

غازی خاں : (جھاڑ اوپر سے اتر کر) کیسی اچھی تال بیٹھ گئی ہے۔ پکایا ہوا لقمہ تیار ہے، بن محنت سے کھا جانے میں کیسی مزہ لگے گی۔ یہ سوداگر بچہ سویا ہے، اتنے میں محل کی کھڑکی پر کھڑی ہوئی شہزادی کو اڑا[2] لے جانے کی خوب تک[3] ہے۔ ایک اشارے پر سب آدھار[4]

ہے۔ میں گمان کرتا ہوں کہ چابک کی آواز سے چتانے
کی انھوں نے مشورت کی ہے۔ رات اندھیری ہے اور
اوپر کا جواہر بھاری ہے، پھر تو ہاتھ مار جانے کی
یہ کھلی ماری ہے۔ مگر ذرا صبر! (سوداگر کے نزدیک
جا کر اس کی تپاس کر کے) کچھ فکر نہیں۔ بے چارہ
آنندی میں ایسا مدہوش ہو گیا ہے کہ نہ اپنی خبر کہ
نہ دنیا کی۔ برادر! رحم کر کے فجر تک سو رہنا۔
اے مورکھ! تو سب ہی خواب میں کھونا ہے۔

[چور چابک بجاتا ہے، شتاب چور، پلہ جھروکے پر سیڑھی
لگا کے مکان کے نیچے اتر آتی ہے اور اسے جلد سے گھوڑے
پر بٹھا کے کپڑے کی گٹھڑی ساتھ لے آپ بھی نکل
جاتا ہے]

فیروز : (آدھی اونگھ میں) خورشید! تو اتنی مدت تک کس
طرح سے بغیر میرے اکیلی رہی؟ عجیب تیری دھیرج،
سگر جان من! کچھ فکر— (بیدار ہو کر) یہ خواب
مجھے کتنا بیزار کرتا ہے۔ بارہ بج گیا ہوگا۔ ابھی پیاری
خورشید اترے گی، نشان کے لیے چابک تو چھوڑوں۔
(اٹھ کر دیکھتا ہے، چابک اور گھوڑا نہیں ہے)۔
ارے! یہ کیا؟ گھوڑا بھاگ گیا یا خورشید اکیلی
نکل گئی؟ (آگے پیچھے دیکھتا ہے) چابک بھی نہیں!
گٹھڑی بھی نہیں! یا خدا! پھر کچھ مہکان آئی، نئے
سورے خانہ خراب ہوا۔ نہیں گھوڑا کہ نہیں گٹھڑی۔
یہ سیڑھی رکھی ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ خورشید
کو کوئی چھٹکا[۸] گیا۔ اب میں موا، موا! (سر کوٹتا

ہے) او بد خواب ! تو نے میرا ستیاناس کیا ، تو نے میرا جواہر لٹا دیا ۔ او خورشید ! ذرا بول کیا ہوا ؟ کس نے تیرے ساتھ دغا کی؟ (طمانچہ مارکر) صد ہزار حیف مجھ پر ، جل جاؤ یہ زندگی ! آہا خورشید پھر گئی ؟ میرا جواہر گیا ؟ دولت گئی ؟ لیکن اے موت ! تو بھی گیا ؟ ارے تو اپنا دل پسند چہرہ بتا اور دے اپنی ٹھنڈی بغل میں مجھے آرام ۔ پھر یہ گریبان چاک ہوتا ہے ، پھر درد کے دریا میں گرتا ہوں ، پھر غمخواری کے غار میں غوطہ مارتا ہوں ۔ خورشید ! اب کہاں پھروں؟ تجھے کہاں ڈھونڈوں ؟ اب کہاں اپنی جان برباد کروں ؟

[گھبرا کر ہر طرف دوڑتا ہے اور ڈھونڈتا (ہوا) جاتا ہے ۔ (دوسری طرف سے) دو دایائیں آتی ہیں]

ایک دایا : ارے ارے ! جی کی مانند جتن سے اس کو رکھی تھی ۔ خورشید نے بڑی غفلتی(د) دکھلائی ۔ بہن ! اب کرنا کیا ؟

دوسری دایا : سب جگہ ڈھونڈ ماری لیکن خورشید کا تو نام و نشان نابود ہوگیا ہے ۔ کس کو خبر کب نکل گئی ، کہاں نکل گئی ، شاہ ملک کے پاس ہرکارہ خبر لے کر دوڑا ہے ، وہ تو باگھ کی مانند کینہ بھرا ابھی آپہنچے گا اور مارے غصے کے خدا جانے اپن پر کیسی ستم گزاری کرے گا (فکر کرتی ہے) ۔

ایک دایا : اررر ! کم بختی دیکھو ، وہ دیوانے کی مثال دوڑا آتا ہے ، اب . . . . (گھبرا جاتی ہے) ۔

[ملک شاہ ، وزیر ، امراؤں ، نفروں داخل ہوتے ہیں]

ملک شاہ : (بڑے غصے میں) کہاں گئی خورشید! اتنی رکھوالی ساتھ کون کھینچ لے گیا؟ وزیر! یہ کتنی بے درکاری؟ کتنی شرمساری؟ امیرو! یہ کتنا اندھیر؟ ناپاک داؤ! یہ کتنی ناموسی! اب کہو، جس پرندے کو میں نے تمھاری حفاظت میں دیا تھا، اسے کدھر اڑا دیا؟ کبھی بھی اپنا بتاؤ، نہیں تو تمھارا سر دھڑ سے اکھاڑ دوں گا۔ اس میں تمھاری طرف سے کچھ بھی دغا اور کچھ بھی فریب ہوا ہے۔ اگر تم اپنی زندگی چاہتی ہو تو میرے چور کو لا حاضر کرو۔ ارے تمھارا خانہ خراب ہووے! میری زندگی کا تکیہ توڑ ڈالا، میری امید کا شیشہ پھوڑ ڈالا! یہ جان مجھے بوجھ ہوا ہے، وہ کبھی اٹھایا نہ جاوے گا۔ شرم ہے، حیف ہے، لعنت ہے، تھو ہے۔ میری حکومت میں ایسی بیدادی! سبھوں کو ٹھگا کے سیڑھی رکھ با ہمت وہ چلی گئی اور تم نے کچھ دیکھا نہیں۔ بس جل جاؤ یہ راج تاج! جل جاؤ یہ مال و محل! پڑے وبا اس پایۂ تخت پر! سارے شہر کا ہو جائے ستیاناس! (تاج پھینک دے کر) توڑ پھوڑ ڈالو یہ نحس تاج! سب جلا کر، میں فقیر ہو کر، سارے جہان میں خورشید کو ڈھونڈوں گا۔ اے خوبرو ٹھگاری! تو کہاں گئی؟ جب تک قالب میں جان ہے، تب تک تیرا پیچھا نہ چھوڑوں گا۔

[دوڑا جاتا ہے]

باب تیسرا

پردہ چھٹا

خیرپور شہر کے باہر ایک باغ

[عازی خاں چور سرجھکا ، اپنا منہ چھپا کر کھڑا ہے ، اس کے حضور خورشید عاجزی اور منت کرتی ہے]

خورشید : میرے جان کا آدھار ! میرے سر کا چھایا دار ، میری چشموں کا کشکا ! مہربان فیروز! اتنا کس لیے غصے؟ آپ نے بہت سی رنج و زحمت کھینچ مجھے بندی خانے سے چھڑائی اور پھر آزردہ رہنے کا سبب کیا ہے ؟ میرے ساتھ ایک سخن بھی نکالتا نہیں ؟ پیارے! کیا آپ سمجھتے ہو کہ میں نے اپنی دامن لٹائی یا میں باخوشی نکل گئی ؟ کبھی اس جان کو ختم کر ڈالوں پر ایسا ذرا بھی سخن تیرے کان پر آنے نہ دوں ۔ اس میں میری کچھ تقصیر نہیں ہے ۔ وہ ناپاک ملک شاہ نے فریب سے مجھے قید ، دغا سے تجھے تباہ کیا تھا ۔ میرے نام دار سردار ! آج تین ماہ ہوئے ، تیرے ہجر کے مارے جل جاتی ہوں ۔ اب تیری محبت بھری زبان کے امرت جھرے سے آرام دے ، ذرا راہِ رحم سے منہ کھول کے مجھے کہہ ، میری کیا تقصیر ہوئی ہے؟

عزیز فیروز ! ذرا دیکھ تو سہی ، میں تیری ہی
خورشید یا کوئی دوسری ؟ (زور سے چور کا ہاتھ اس
کے منہ پر سے کھسیڑ[۳] کے غیر مرد کو دیکھ گھبرا
ہو کر) ارے تُو کون ہے ؟ مجھے یہاں کس واسطے
لے آیا ؟ میں نے تو اپنا خاوند فیروز سمجھ کے اتنی
بکواس کی - وہ میرا خاوند کدھر ہے ؟ اے لعنتی !
مجھ پر یہ کیا جفا لایا ؟ کیا اسی بد دیانتی کے لیے
اب تک سے تُو اپنا کالا منہ نہیں بتاتا تھا ؟ اے
بدکردار ٹھگ ! اس لیے اپنی پلید زبان بند کی تھی؟
اے بدکار ! تُو اپنے واسطے نیک خواہ ہو تو ابھی
کے ابھی جہاں سے لے کر آیا ہے ، وہاں مجھے پہنچا ،
نہیں تر یہ جان نکال ڈالتی ہوں ، یہ چشمیں پھوڑ
ڈالتی ہوں ، یہ گلا پھانسے سے قبض کرتی ہوں -
اے نا پاک چور! تجھے ایسا کالا کرم کرنے میں کچھ
بھی شرم نہ آئی ؟

غازی خاں : (دو زانو بیٹھ کر) اے زمانے میں آشکار، نیک کردار
بانو ! سچ ہے کہ میں چور ہوں ، راست ہے کہ میں
نے آپ کو ٹھگا اور لعنت مجھ پر کہ میں نے آپ کو
پھنسائی ، لیکن وہ تمام نفرین ، شرم اور لعنت ، تمھاری
پاکیزہ محبت کے لیے میں صبر سے اختیار کروں گا -

خورشید : اے دیوانے ! تُو نے کیا مجھے بازار میں بیٹھنے والی
بے شرم قحبہ دیکھی؟ کیا مانند تیرے ایک مفلس اور
بد گوہر چور کے لیے حق تعالیٰ نے مجھے بنائی؟ احمق!
جو کوئی بادشاہی محل میں چین سے نہ رہی تو تیری
کنگال جھونپڑی میں آرام پاوے گی ؟

غازی خاں : نام دار خاتون ! خوبی اور خوب صورتی کا سرود ہی غریب جھونپڑے سے میرے پاکیزہ پیار کا نرمل پھوارا چھوٹ کر آپ کو راحت و آرام کے آب سے بھگا دے گا اور جب میرا جگر و جان آپ سے کم تر گنتا ہوں ، تو تمام حاجتیں آپ کی مرضی کے موافق حضور کیوں نہ دھروں گا ؟

خورشید : بے وقوف ! زیادہ کہنے کی یہ جگہ نہیں ۔ اتنا ہی بس کہ اب کیے ہوئے کی پشیانی کر ، پیچھے ہٹ !

غازی خاں : خاطری سے جان پیاری کہ میں آخری جان پر آیا ہوں ۔ تجھ سی نادر چیز ہاتھ آئی میں کبھی دوسرے کے ہاتھ جانے ہو نہ دوں گا ۔ اگر تو نہ سمجھے گی تو یہ خنجر سے اول تجھے بےجان کر ، تیرے اوپر میں بھی اپنا جی نثار کروں گا ۔

خورشید : (دل میں) اب پھنسی تو سہی ، یہ بڑا بے وقوف ہے ، تو اس کو مکاری عورت کی کچھ صفت سے فریب کے جال میں پھنسا کر ، اپنے جی اور پاک دامنی بچانے کا یہی وقت ہے ۔

غازی خاں : جان ! اب اندیشہ کیا کرتی ہو ؟ چلو میرے ساتھ میرے گھر میں اور دیکھ لو آپ کو زرِ نگار محل میں بٹھا کے دنیا کی تمام خانونوں کو حسد کی آگ سے کیسا جلاتا ہوں ۔

خورشید : خیر جو ہونے کا تھا ، سو ہوا لیکن شیر کے پھنسے سے بہتر شکاری کے ہاتھ میں جانا ۔ تیرے غریب خانے میں رہنا بہتر ، پر وہ ناپاک ملک شاہ کے حرموں کے بندی خانے میں جانا برا ہے ۔ چل میں تیرے ساتھ

رہنے میں راضی ہوں ۔ مگر تو میری راحت و آرام
پر نگاہ رکھیو اور مجھے کچھ درد و غم مت پہنچائیو ۔
تو بھی نوجوان اور خوبرو ہے اور میں بھی ویسی
ہوں ۔ تو پھر عمر بھر خوشی کے ساتھ ایک گوشے
میں کٹ جائے گی ۔

غازی خان : آفرین آپ کی ہمت و دانائی پر، آج تو نے مجھے بہشت
بریں میں پہنچا دیا ۔ جان! بے فکر رہ ، تیرے ایک بال
کو بھی میں ضرر پہنچنے نہ دوں گا ۔ تجھے امن چمن
میں رکھوں گا ۔ اب تو چل عزیز! میرے ساتھ سہر
میں چل ، تجھے دیکھ ماں باپ اور سب خویشاوند[۳]
خوش خوش ہو جاویں گے ۔

خورشید : نیک بخت ! تیرے ساتھ شہر میں چلے آنے سے مجھے
بہت شرم آتی ہے ، خویشاوند اور لوگ ایک آواز سے
کہیں گے کہ میں کوئی بدکار رنڈی ہوں کہ بن نکاح
کے نکل آئی ، پھر میری عزت کیا رہے گی ؟ بہتر تو
یہ ہے کہ تو شتاب اپنے شہر میں جا اور اول اپنے
خویشاوند کو آگاہ کر اور بڑی سی مجلس لے کے دوڑ
دمام اور ڈھول نقارے کے ساتھ دولھا بن کے مجھے
بلوانے کو یہاں آ ۔ اتنے میں میں بھی بن ٹھن تیار ہوتی
ہوں ۔ اور آخر باجتے گاجتے باخوشی کے ساتھ شہر میں
جاویں ۔ پھر میں تیری حقدار عورت کہلاؤں گی ۔
مگر جلدی سے پیچھے آئیو ۔ میں یہاں اکیلی جھور
رہوں گی ۔

غازی خاں : (خوش ہوکر) یا اللہ ! مجھ غریب پر تیری اتنی
مہربانی ! (خورشید سے) اے دل نواز ! تیرا مجھ پہ

کتنا احسان ۔ آپ نے مجھے کم درجے سے بلندی پر چڑھا
کر سُکھ باسی بنا دیا ۔ آج دنیا میں میرے موافق
قسمت دار کوئی بھی نہ ہوگا ۔ جگر من! لے (ہاتھ سے
انگوٹھی نکال کر دیتا ہے) یہ انگشتری میری محبت کی
نشان بہ‌دل اپنی چاندی سی انگلی میں ڈال ۔ اے دلربا!
یہ انگشتری بے مول ہے ، اب تک وہ جہاں‌دار ساہ
کی بیٹی گل جہر کے دست کو رونق بخش تھی ۔ مگر
میرے ہاتھ میں یہ کس طرح سے آئی ہے؟ سو میں تم
کو پیچھے سے کہوں گا ۔ اب میں رخصت لیتا ہوں ،
میری حاضری میں آزردہ مت رہیو جان !

[جاتا ہے]

خورشید : (پیچھے سے ہاتھ کرکے) آخر چور کے پوٹلے دھول کی
دھول ، بددیانتی چور ! ایسا تو اندھا بن گیا ہے کہ
عقل کے ساتھ یہ بے مول جواہر کھودیا ہے ۔ ناپاک !
تیری سزا اس سے بہتر تو نہیں ، اب یہاں کھڑے
رہنے میں سلامتی نہیں ہے ۔ یا الٰہی اے خلق کے
خداوند ! اب بہت ہوا مجھ دل فگار پر ، ابھی تو کچھ
رحم کرکے مجھے حادثوں سے چھڑا ۔ فیروز ! فیروز !
تیرے لیے کس کس طرح کا فند و فریب ہوتا ہے پر
کچھ فکر نہیں جان ! امید رکھ ، امید سے آخر اپنی
قسمت کا پانسا ، پھر دلاسے کے دالان میں اپن کو راہ
دیوے گا ۔

[جاتی ہے]

باب چوتھا

پردہ پہلا

خیرپور میں جنگل

[کوتوال فیروز شاہ کے لباس میں داخل ہوتا ہے]

کوتوال : گھر و گھر اور شہر و شہر بھٹکا مگر اب تک وہ بدخواہ فیروز شاہ ملتا نہیں ۔ وہ ناپاک نفر نے مجھے ٹھکایا تو نہ ہوگا ، لیکن اب تک ایک آخری جگہ تلاش کے لیے باقی رہی ہے ، وہاں جانے کی راہ بھی یہی ہے ۔ واہ ! اس کا لباس میرے بدن میں کیسا درست آیا ہے ۔ جب اس کا لباس مجھے درست ہے تو پھر اس کی عورت بھی مجھے کیوں نہ درست آوے ۔ ایک باری دیکھتا ہوں تو اس کے موافق میرا قد و قامت ہے ، گھاٹ[1] گھٹم بھی اس کے مثال ہے ۔ بلکہ جوانی بھی اس سے زیادہ ، دولت میں زیادہ ، جاہ و جلال میں زیادہ ، حسب و نسب میں زیادہ ، اور مردان مرد ہوں ۔ لیکن اتنی سرسائی[2] کے ساتھ بھی وہ غرور خورشید مجھے چھوڑ دے کے اسی کو پکڑ رہی ہے ۔ مجھ پر کراہت اور اس پر چاہ ! کچھ فکر نہیں ، اس شمشیر کے نزدیک آدمیت کیا بساط رکھتی ہے ۔ مجھ

فیروز جو گھڑی جاتی ہے ، اس میں تیرا سر اڑ جائے گا ، تیری پیاری لٹ جائے گی بلکہ تیری مہردار یار اپنی دامن میرے ہاتھ میں دے گی ۔ ارے ! میں نے بھلے بڑوں کو مات اور سینکڑوں کی گھاٹ کر ڈالی ہے اور وہ فتح شاہ کے دو حاسد جوان سرداروں کو پل بھر میں میں نے موم بنا کے جہان سے نابود کروا دیا ہے ، تو پھر فیروز کیا حساب میں ہے ؟

[جہاں بخش پیچھے سے داخل ہوکر ، کوتوال جو بولا سو سن کر]

جہاں بخش : فتح شاہ کے مغرور سردار ! یہ سخن ہم بھائیوں کے لیے نہ ہو گا ؟ (سنبھل کر دیکھتا ہے) یہ تو میری پہچان کا معلوم ہوتا ہے ۔ کون ؟ وہ بدکار کوتوال ! ہاں ہاں یہ وہی ناپاک ہے ! اے چھپا ہوا کینہ اٹھ ! ابھی شتاب اٹھ ! اپنے پاؤں سے چل کے شکار پھانس میں آ پھنسا ہے لیکن اول میرے برادر کو یہاں بلا کے اس کی نظر پاس بدلہ لوں کہ اس کا بھی ارمان پورا ہووے ۔

[وہ جاتا ہے ، اتنے میں کوتوال کی نظر اس پر پڑتی ہے]

کوتوال : صبر ! اے چور ! کدھر بھاگتا ہے؟ تو کون حرامزادہ ہے اور کس لیے بھاگتا ہے ؟

جہاں بخش : اے موذی ! زبان کو تھام رکھ ، اگر نہیں تو ابھی کاٹ لوں گا ۔

کوتوال : تُو حور ہے یا پنڈھارا ؟ شتاب میرے تابع ہو ، نہیں تو ابھی جان سے جائے گا ۔

جہاں بخش : کس کے تابع ہووے ؟ تُو نامرد کے ؟ تجھ ترکٹ باز کے ؟ اے ناپاک دیو ! یہ ایک ہی ہاتھ تیری پلید جان کو تابع کرنے کے لیے کافی ہے ، تُو کون ہے کہ میں تیرے تابع ہوں ؟

کوتوال : تُو مجھے پہچانتا نہیں کہ میں کون ہوں؟ اے جنگلی !

جہاں بخش : جنگلی ! اے خونی ؟ اے لعنتی ! اس جنگل میں کوے بہت بستے ہیں مگر آج تک سوائے تیرے مور کے پیچھے میں کسی بھی کوے کو میں نے دیکھا نہیں ۔ اے بد کوے ! جنگل کے باگھ کے سامنے تو ایک پل بھی ٹکے گا نہیں ۔

کوتوال : اے احمق ! اب تک تُو نے مجھے نہیں پہچانا ؟ جب پہچانے گا ، تب تیرے سارے بدن میں کنپاری چھٹے گی ۔ سن ! میں فتح شاہ کا نام آور کوتوال ظفر خاں ہوں۔

جہاں بخش : کس سے کنپاری لرزہ چھٹے گی ؟ کیا تجھ سی لومڑی سے ؟ اے بے وقوف ! تُو اژدھا ، بچھو یا مگرمچھ کی صورت میں بدل جائے ، تب بھی میں تُو ناپاک زادے سے نہ ڈروں ۔ اے موذی ! یہ سن اور جینے کی امید چھوڑ ۔ میں تجھے آگاہ کرتا ہوں کہ فتح شاہ کی بارگاہ کا وہ جوان مرد جہاں بخش خود میں ہوں ۔ سبب سے تیری بدکاری اور چغلیوں کے ، آج ہم دونوں برادروں اس جنگل بیابان میں آ پڑے ہوئے ہیں ۔ چل اب شتابی کر ! موت کی صحبت ! میں تجھے اٹھا کر کینے سے اپنا سینہ پاک کرتا ہوں ۔

[جہاں بخش کا نام سن کے کوتوال گھبرا جاتا ہے مگر
شرم کے لیے دھام دھوم سے تلوار نکالتا ہے اور دونوں
لڑتے لڑتے اندر جاتے ہیں ۔ جہاں گیر اور بہادر خاں
داخل ہوتے ہیں]

بہادر خاں : اے قدرت! تو یہ بادشاہ زادے میں چھپی ہوئی ہے؟
مگر اس چہرے کے اجالے سے تو فوراً ظاہر ہو جاتی
ہے (جہانگیر سے) ۔ اے شہزادے ! آپ کا مقام
رنگا رنگ گلوں سے بھرے ہوئے باغ بہار میں لایق
تھے۔ وہ چھوڑ کر کس لیے اس خاردار جنگل میں زندگی
ختم کرتے ہو؟ یہاں آبدار گوہر پڑے ہیں لیکن آج
اس کی خوبی پہچاننے والا ، اس کی قدر بوجھنے والا اور
اس سے نفع لینے والا یہاں کوئی نہیں ہے ۔

جہانگیر : بھلے مرد! ہمارے واسطے تیری دلسوزی دیکھ ، ہم
دونوں برادر تیرے احسان مند ہوتے ہیں ۔ کیا علاج
جب قسمت کا چرخہ الٹا پھرے ، تب حرمت ، عزت ،
حسب و نسب ، گنج و دولت ، سب انسان کو چھوڑ
جاتا ہے ۔ ہم لوگوں تو بہت بھی چاہتے ہیں کہ اپنے
بزرگوار پدر شاہ ہمایوں کی با مدت سے قدم بوسی کریں
اور ان کی نابود ہوئی امید کو تازگی سے بھریں
مگر لاعلاج کہ جنگل کے اطرافوں ہمارے نکلنے کے
لیے بند کیے ہیں ۔ کیونکہ وہ فتح شاہ نے یہاں ہم کو
دیش نکال کروایا ہے ، کبھی بستی میں ہم کو دیکھے
تو جان سے مارنے کا حکم کیا ہے ۔

بہادر خاں : سورے سردارو! آج کا روز تمھاری مہمانداری کے لیے
ہے اور میرے صاحب طرف تمھاری محبت کے لیے

اور وہ بد ذات کوتوال کے طرف تمھارے غصے کے
لیے ابھی کے ابھی بندہ ایک مشکل سر پر لیتا ہے
کہ شتاب شہر شرف آباد پہنچ کر شاہ ہرہوں کو آپ
کی حقیقت سے واقف کرکے ، ان کے ضعیف بدن اور
بے تاب دل کو قوت کے لہو سے بھر ڈالوں ۔ ایسا
کروں کہ بے شمار سپاہ اور دبدبے کے ساتھ وہ آپ
کے استقبال کو آئیں اور فتح مندی کے ساتھ فتح شاہ
پر قیامت اٹھائیں اور ان کے کم عقل درباریوں کو
رسوا اور اس کم بخت کوتوال کو لائق سزا دیویں ۔

[جاتا ہے]

جہانگیر : دنیا چاہے ویسی دو رنگی ہے ، آدم چاہے ویسے
دغا خور ہیں ۔ خون ، چوری ، لُچائی ، ظلم چاہے
ویسے شہروں میں برپا ہے ، تو بھی شہر بھلا اس
برے بیابان سے ، بے مروت دنیا کی آشنائی بھلی ،
مگر یہ تنہائی تو اب نہیں بھاتی ۔

[جہاں بخش داخل ہوتا ہے ، ہاتھ میں کوتوال کا کاٹا ہوا
سر دھرا ہے]

جہاں بخش : برادر عزیز اب اٹھ ! سب غمی بھول جا اور
خوش حالی کا شربت پی ۔ تیرے واسطے ایک بے مول
ہدیہ لایا ہوں ۔

جہانگیر : برادر یہ کیا ! آدم کا خون ؟

جہاں بخش : گھابرا مت ہو ۔ اس خون میں اپنی چشموں کا زہری
خون نکل گیا ہے ۔ اس خون^ کے غلیظ لہو میں
اپنی غیر انصافی اور اپنا ظلم دھویا گیا ہے ۔ یہ کس
کا سر ہے ؟ کچھ پہچانتے ہو ؟

جہانگیر : یہ سر تو وہ کم بخت کوتوال کا ، کہاں سے وہ اِدھر آ چڑھا اور کس نے اس کا خون کیا ؟

جہان بخش : تقدیر کے حکم سے یہ کوتوال اس جنگل میں آ پہنچا اور اچانک میرے مقابل ہو گیا ۔ مجھے پہچان کے میرے ساتھ حجت کرنے لگا اور جنگ مچانے لگا ، تو میں نے مارے غصے کے اُس کا سر شمشیر سے اُڑا دیا ۔

جہانگیر : بھائی ! چاہے کتنا ہی وہ بدکار تھا ، تو بھی اس کے بد خون سے اپنا پاکیزہ دست ناپاک کرنا خوب نہ تھا ، اس ہونے سے میں بہت ناخوش ہوں ۔

جہان بخش : نا خوش ہونے کا کچھ سبب نہیں ۔ یہاں اپن کو کس کا ڈر ہے ؟

جہانگیر : خدا کا تو ڈر ہے ، اس کی نظر میں یہ گناہ عظیم ہے ۔ جا ، شتاب جا کر اس سر کو وہ پاس کی ندی میں پھینک دے اور اپنے رنگین ہوئے ہاتھوں کو اُس پاک پانی سے پاکیزہ کر، اور حق تعالیٰ کی بندگی میں مشغول ہوکے اس تقصیر کی معافی چاہ ، کیونکہ دشمن چاہے جتنا بُرا ہو ، تو بھی اس کی سزا وہ خاوند کے ہاتھ سے ہونی چاہیے ۔

جہان بخش : تیری مرضی کے موافق چلنے میں خوش ہوں ، لیکن بھائی ! اب تو اس جنگل چھوڑ ، کوئی اور لباس سے دوسرے شہر میں نکل جانا بہتر ہے ۔ اپنا زبردست حریف تو اس دنیا سے نابود ہوا ہے ، تو اب زیادہ دہشت نہ رہے گی ۔

جہانگیر : سچ ہے برادر ! اب تک دنیا کی محبت اور دنیا کے

عیش و آرام سے اپنی بے بہرہ رہے ہیں ، تو چلو یہاں
سے نکل کر کوئی راحت کی جگہ اختیار کیجیے -

[دونوں جاتے ہیں اور (دوسری طرف سے) خورشید داخل
ہوتی ہے]

خورشید : اے آسمان کے بلند چرخ ! کیا دنیا کی سب نازنینوں
میں سے تیری گردش میں پسنے کے لیے میرے سوا
دوسری کوئی نہیں تھی کہ بار بار تو سبھوں میں سے
گھسر لسر لاکر مجھے چورتا ہے ؟ اے بے مہر ! ایک
پہاڑ سا آدم بھی ایسے دم بدم حادثوں سے چورا جاوے
تو میں تو ایک نازک بدن شہزادی ، شاہوں کے
حرم میں رہنے والی ، اس دکھ کا بوجھ کیوں کر اٹھا
سکوں ؟ قسمت میرے کی رفتار عجیب ہے کہ بہت
سی کوششیں کر کے جب نیک وقت کی امید اوبر
آتی ہے ، یا جب میری تدبیروں اور حقیقت کا مردار
گھوڑا پڑتا کھڑتا جینے کی نوک پر آتا ہے کہ اتنے
میں قسمت کا تیز رفتار گھوڑا ایک ہی چھلانگ سے
ایسی تیزی بتاتا ہے کہ پھر امید کے گھوڑے کو
سینکڑوں قدم پیچھے ہٹا ڈالتا ہے - میں نہیں جانتی کہ
میرے طالع میں آخر کیا لکھا ہوگا - (بادل اور بجلیاں
چمکتی ہیں) آج میں کہاں آ پڑی ہوں ، بہار کی گھٹا
تو خوب چڑھ رہی ہے ، اب کہاں جاؤں ! سب جگہوں
میں کالاٹ[۹] ہو رہی ہے - راہ بھی تو سوجھتی نہیں -
اے فیروز ! ذرا میری تو مدد پہ آ ، اب تیری
ضرور[۱۰] ہے - ذرا آ کر تو اپنی نظروں سے دیکھ کہ یہ
تابناک خورشید بھی میرے سامنے کیسا روٹھا ہے - اس

ہیبت ناک بیاباں میں کوئی ہمدم کہ ہمراہ تو نہیں
پر اس نے میرے واسطے اپنی روشنی بھی کم کر کے
سب بیاباں سیاہ بنا دیا ہے اور میری راہ بند کرنے کے
لیے بادل اور بجلیوں کے جھکڑ مجھ پر چھوڑ دے ہیں ۔
اے خورسید ! اگر قدرت کی مرضی تجھے یہاں سے آگے
چلنے کی راہ نہیں دیتی تو تو بھی یہاں ٹھہر ۔

گانا[۱]

بِن پیا گھٹا نہیں بھاوے ، رہ رہ دل کو گھبراوے
بجلی کی چمک تڑپاوے ڈراوے ، بِن پیا گھٹا نہیں بھاوے
امنڈ گھمنڈ کے کالی بدریا ، موہے ناحق نہ ستاوے ،
یوں پون پروائی سے جا کہو اور ملک برساوے، جاوے
——بِن پیا گھٹا
بھیجت ہوں آنسوؤں کے بوندن مبگھا جھر نہ لگاوے
پیارا پیا کو مان کے اپنے بن پربت پر جاوے جاوے
——بِن پیا گھٹا

[دونوں بھائی سحھرے سے نکل آے ہیں]

جہانگیر : (نزدیک جا کر) اے آسان پر رہنے والی ! (خورشید چونکتی ہے) ۔

جہاں بخش : گھابری مت ہو، کاہے کو انی چونکتی ہے ۔ ہم تیرے رفیق ہوویں گے ۔

جہانگیر : اے جنت کی حور ! یہاں تیرے آتر آنے سے یہ برا بیاباں یکایک روشن ہو گیا ہے ۔

---

۱ ۔ ”ساون“ (حاشیۂ مترجم) ۔

جہاں بخش : مجھ آدم کی گود میں تجھ پری زاد کا باسا کرنے سے میرے سیاہ دل کو جاوداں تک کی راحت ملے گی ۔
خورشید : نہیں ! کبھی نہیں ! ایسا نہیں ہوگا ۔ میں تمھارے لائق نہیں ہوں ، اور بھی کوئی "دو واری کا" نہیں ہوں ۔
جہانگیر : نیک بخت ! اب تو تو نے اپنے خاوند کو بھول جانا ۔ ایسا گمان مت کریو کہ ہم کوئی ردالے ہوں گے لیکن ہم حسب و نسب بادشاہی رکھتے ہیں ۔ (چھوٹے بھائی سے) برادر جہاں بخش ! اب اپنے بڑے بھائی کی خوب چہر مہر دار کی جانب میں سر جھکا ۔
جہاں بخش : کس کی مہردار ؟ شاید تو دیوانہ ہوا ہے ، یہ تو جوان ہے اور میں بھی جوان ، تو یہ مجھے لائق ہے ، تب اس کو تجھے اپنی بیٹی مثال گننا چاہیے ۔
جہانگیر : اللہ اللہ کرو جی ۔ ایسی بات کب ہووے ۔ میں بڑا ہوں اور تجھ سے درجےمیں بھی زیادہ ہوں ، تو اس پر میرا حق ہے ۔
جہاں بخش : تیرے کہنے سے فقط تو درجہ عالی ہوا کیا ۔ میں وہ بات قبول نہیں رکھتا ہوں ۔
جہانگیر : بے ادب ! اب بند کر تیرے بے پروا زبان ۔ نہیں تو میری شمشیر سے ابھی کٹی جاوے گی ۔
جہاں بخش : اس غروری میں سر اڑ جائے گا ، اور بھی زیادہ مجھے خشم ناک کیا تو شتاب تیرا برا حال ہو جائے گا ۔

[دونوں بھائی اپس میں جھگڑے ہیں]

خورشید : (دل میں) ڈھب جھب اور چالاکی سے تو کوئی درجے والے معلوم ہوتے ہیں ، پھر ان کے ہاتھ سے نکل

بھاگنے کی کچھ نئی تدبیر کرنا چاہیے۔ (سرداروں کو)
نیک مردو! بہادر سردارو! عبث کس لیے آپس میں
جنگ مچاتے ہو؟ میری نظر میں آپ دونوں یکساں
ہو، دونوں خوبصورت نوجوان ہو، دونوں بڑے
جنگی ہو، دونوں بادشاہی درجے والے ہو، تو آپ
میں سے ایک کو آزردہ کر، دوسرے کو پسند کرنے
میں خوشی نہیں، لیکن دونوں میں سے مجھے جو
جوان مرد معلوم ہوگا اس کو میں قبول رکھوں گی۔
اس لیے بہتر تو یہ ہے کہ ایک تیر وکمان مجھے دو،
میں ایک تیر اپنی تمام قوت سے دور پھینکتی ہوں،
تم دونوں میں سے جو کوئی وہ تیر پہلے لا کر مجھے
دے گا، اس کے تابع میں ہوں گی۔ بولو یہ
سچ[۱۳] تم کو پسند آتی ہے؟

جہانگیر: یہ خوب بات ہے۔

جہاں بخش: اور اس پر میں بھی راضی ہوں۔

[خورشید زور سے تیر پھینکتی ہے اور دونوں اس کے
پیچھے دوڑ جاتے ہیں]

خورشید: یہ نئی بلا کا مارا، الٰہی کی مہر سے رنع تو کیا۔
(ہاتھ جوڑ کر) اے خدا! ایسی خطر میں تُو ہمیشہ
مجھے پناہ دیجیو اور بے تفصیر، بن والی عورت کا رفیق
ہوئیو! تیری پسند کی ہوئی سچی عورت وہی ہے کہ
جو پھسلاہٹ اور لالچ اور زر سے نہ للچائے، کیونکہ
لوہے کے مانند سخت دلوں کو نرم کرنے والی یہ
تیغے نیز[۱۴] آتش ہے، آج میں اس لیے غرور ہوں کہ

تیر اندازوں کے تیر جس طرح چھوٹ کر آسمان کے
چوگان میں نابود ہوتے ہیں ، ویسے ہی میری
ناک دامنی کے آسمان میں ، بد دیانتی کے تیر ہر دفعہ
چھوٹتے ہیں ۔ ان سبھوں کو میں آسانی سے چھٹکا
ڈالتی ہوں ۔ اب تو بھاگنے کی یہ فرصت غنیمت ہے ،
مگر لباس مردانہ پہن کر بھٹکنا بہتر ہے ، نہیں تو اور
کوئی بلا میں پھنس جاؤں گی ۔

[جاتی ہے (دوسری طرف) جہانگیر ہانپتا ہوا داخل ہوتا
ہے]

جہانگیر : چاہے جتنا بھائی میرا مدعی ہووے ، لیکن میں نے
اپنی قوت سے اس تیر کو پہلے لا کر حاضر کیا ہے ۔
تو اب وہ خوب رو عورت کو میں کیوں نہ لوں ؟
(آس پاس دیکھ کر) اوہ ! کدھر گئی وہ پری ؟ کیا
آسماں میں پیچھے اڑ گئی ؟ یا زمین کے پیٹ میں اتر گئی ؟

[دوسرا بھائی بھی آ پہنچتا ہے]

جہاں بخش : میں کبھی تیرے ہاتھ آنے نہ دوں گا ، اس کو میں
زور و ظلم سے لوں گا ۔

جہانگیر : خالی کاہے کو زیر و زبر ہونا ہے ۔ دیکھ ! تیری حجت
میں تو وہ اپن دونوں کو اڑا کر بھاگ گئی ، اب
ہاتھ گھستا بیٹھ ۔

جہاں بخش : کیا گئی ؟ ہاتھ سے گئی ؟ (زمین پر پھسل پڑتا ہے)
تب یہ جان کس کام کی ؟ ارے اس کے دیکھنے پر تو
میری حیاتی تھی ۔ سارے جہان کی امید اس پر تھی ،
بہشت کا آرام اس سے تھا ۔ وہ کہاں جائے ؟ فقیر

بن کے ساری دنیا ڈھونڈوں ، جب تک جان ہے تب
تک اس کو جانے نہ دوں ۔

[جاتا ہے]

جہانگیر : اب میں کس کی راہ دیکھوں ! جب میں جان پر آیا
تو مجھے کس کی درکار ہے ۔ جوگی بن کے جاؤں ، یا تو
وہ نازنین کو ڈھونڈ لاؤں یا اپنی موت کو پاؤں ۔

[جاتا ہے]

باب چوتھا

پردہ دوسرا

خیر پور شہر کے باہر ایک باغ

[غازی خان دولھا ہیں ، بڑی سی مجلس لے کر آتا ہے ، ڈھول نقارہ بجتا ہے اور رامش گریں گاتی بجاتی چلی ہیں]

رامش گریں : **غزل**

بتا دے غازی راہ اب وہ دلدار کہاں ہے
جو دل آزار تمھارا وہ دل آزار کہاں ہے
ــــــ بتا دے

تو نے جنھوں کے اوپر تن من فدا کیا ہے
وہ تیرا خورشید زر افشار کہاں ہے
ــــــ بتا دے

انتظاری سے تڑپتا ہے دل ہم سبھوں کا
جتادے وہ دلھن کا اب در و دار کہاں ہے
ــــــ بتا دے

غازی خاں : دوستو ! آگے چلو ! دلھن یہ باغ میں بیٹھی ہے ۔ کیا بات کہوں ، کبھی زمانے میں کسی نے ایسی خوبصورت اور خوب نما عورت دیکھی نہ ہو گی ۔

بندے نے بہت سا زر و مال خرچ کیا ، تب اس ماہ رو
کو ہاتھ میں لایا ہوں ، اس کی کیا تعریف کروں ۔

ایک دوست : دوست ! آپ تو بڑے قسمت دار ہو اور ہم بدنصیب ،
بھلا تم خوش تو ہم بھی خوش ۔

غازی کا باپ : شاباش بیٹا تجھے ! بہت مدت سے آیا ، لاکھوں کا
روزگار چلایا اور اپنے ساتھ پری سی ایک جورو لایا ،
تو بڑا سیانا ، تیری کیسی تعریف کی جاوے ۔

غازی کی ماں : نور چشم بیٹا ! اب جلد سے میری بہو مجھے بتا دے
کہ اس پر موتیوں کا نثار کروں ۔

غازی خاں : ذرا دھیرج دھرو جی ! ابھی اپنی جورو کو بتا کے
سب کو خوش خوش کرتا ہوں ۔ (بلاتا ہے) خورشید !
پیاری خورشید ! واہ کیسا لذت بھرا نام ہے ۔

دوست : بھائی ! یہ آپ کو سدا مبارک ہووے !

[سب کوئی تالی بجاتا ہے]

غازی خاں : خورشید ! خورشید ! جانِ من ! میں آ پہنچا ہوں ۔
ابھی باہر آ ۔

[کچھ جواب ملتا نہیں تو گھبرا کر سب جگہ ڈھونڈتا ہے]

دوست : کیوں دوست ! تیری خورشید کدھر ہے ؟

غازی کا باپ : بیٹا تیری جورو کہاں ہے ؟

غازی کی ماں : غازی ! کدھر بٹھایا ہے دلھن کو ؟

غازی : (دل میں) ہائے ہائے خانہ خراب کدھر گئی ! اررر !
بھاری تماشہ ! ارے تیرا ستیاناس ہووے خورشید !
تونے یہ کیا موکان بالی ؟ ! ادھر سے بھاگ گئی کیا !

ایک دوست : چل غازی ! اندیشہ کیا کرتا ہے ، اگر اپنی خوب چہرہ

جورو ظاہر میں بتانے کی مرضی نہیں تو دردے میں
بلا ، چل وقت مت لگا ۔

[ساری زمانہ گھابرا ہو کے ڈھونڈ ہے]

غازی کا باپ : یہ کھونا کھنٹورا[۳] ڈھونڈتا کیا پھرتا ہے ؟
غازی کی ماں : بیٹا کیوں ایسا کرتا ہے ؟
غازی : ارے میری جورو تو کدھر بھاگ گئی ۔
دوست : کیا بکواس کرتا ہے ؟ کچھ ٹھٹھہ بازی لگئی ہے کیا ؟
غازی : سچ برادرو ! وہ تو بھاگ گئی ۔
باپ : سبھوں کے نجیک[۴] مجھے بہت برا لگتا ، تو کیا ضعیفی
میں میری فضیحتی کرواتا ہے ، اب بول دے ؟
غازی : (روتا ہوا) بزرگ باپ ! وہ بھاگ گئی تو میں کیا
کروں ؟ مجھ پر بڑی آفت آئی ۔
ایک دوست: مارو رے اس لچے کو ، یہ کیا ڈھونگ مچاتا ہے ،
اے بے وقوف ! اے دیوانہ ! ہم کو یہاں تک کاہے
کو تکلیف دی ؟
غازی : تم کاہے کو آئے ، وہ گئی تو میں کیا کروں ؟
باپ : احمق! بھاگ گئی ، یہ کچھ ہنسی کی بات تھی ؟

[مارتا ہے]

ماں : مر مؤا دیوانا ! مؤا دھنی ہوکر آیا ، لعنت تیرے
اوپر ، تھو تیرے اوپر۔
غازی : لعنت کو میں کیا کروں ؟
ایک دوست: مگر اے کم بخت ! یہ بھی کچھ بچہ بازی تھی !
غازی : (دل میں)یہ ہوا کیا؟اس کومیں پسند نہ پڑا کیا ؟ اررر !
باپ : تیرا خانہ خراب ہووے ، سارے شہر میں میری اور

سبھوں کی عزت لٹائی ، اب کون سا منہ لے کر پیچھا جائیں ۔

غازی : اس میں میری کچھ تقصیر نہیں ، اب چاہے سو کرو ۔

ایک دوست : چاہے سو کرو ؟ مار ڈالو اس لچے کو ۔

[سب کوئی تھول بھبراگ کرتے ہیں اور غازی بھاگتا ہے ۔
تمام مجلس سور و پکار کرتی جاتی ہے]

غازی : ارے ارے ! ایک نہیں پر دو ستم ، رانڈ کا آزار اور لوگوں کی مار ۔

[جاتا ہے]

باب چوتھا

پردہ تیسرا

جنگل

[جنگل میں کوتوال کا سر بغیر دھڑ کے پڑا ہے اور خورسید
مرد کے لباس میں آتی ہے]

خورشید : اب کیا کروں ؟ کہاں جاؤں ؟ کس کی پناہ لوں ؟
ارے جدھر جاتی ہوں ، اُدھر میرا ہی حسن میری
جان کا لینے والا ہوتا ہے ۔ اب علاج کیا کروں؟ کیا
یہ خوب روئی خراب کر ڈالوں ؟ کیا اس شکل کو
سیاہ کروں ؟ کیا اس دیپک دیتی پیشانی پہ بدصورتی
کے داغ رکھوں ؟ جو دیکھتا ہے سو مجھے پکڑتا ہے ۔
اب کس کس کو جواب دوں ؟ عورت کے لباس
میں جب پاک دامنی لٹانے کا ڈر رہتا تھا ، تو اب
دیکھوں، اس مرد کی پوشاک میں کیسی سلامتی ہے۔ اس
بیابانِ بے پایاں میں ایک عورت کو اکیلی رہنا مصاحت
نہیں ہے ۔ اے فتح شاہ! تو کبھی آرام مت دیکھیو !
اے بدکار ملک شاہ! تیری بدی کا درد فتح شاہ کے
ظلم کے ساتھ مل کے یہ زندگی ختم کرنے کو مجھے
اسکیرتی ہے ۔ لیکن فیروز! تیری پاک محبت میرے
سامنے دھیرج کی آڑ کرتی ہے ۔

[خورسید آگے جاتی ہے اور بازو پر ایک پڑا ہوا مُردہ
دیکھ کر چونکتی ہے]

یا خدا ! یہ لہو سے لپٹا گیا آدم ؟ ارے میرے مغز میں کچھوں[۲] کا دھواں پیوست ہوتا ہے ، میں بہت سی گچھواتی[۳] ہوں ۔ یہ کیا ! خواب دیکھتی ہوں یا بیداری ! آج میری آنکھیں کیا اندھی ہوتی ہیں ؟ ارے حھاتی دہشت سے دب جاتی ہے ۔ او اللہ ! یہ خواب کہاں سے ہووے ؟ کیا سر بغیر کا سربر ! میری جان فیروز کا پوشاک ، او ! میرے خلوند کے پاؤں ، او ! یہی اس کا مبارک ہاتھ ، یا الٰہی ! یہ کیا دیکھتی ہوں ، تمام بدن کے ہُو بہُو نشان ۔ لیکن کہاں گیا اُس کا چہرہ کہ اسے دیکھ ایک دم جہنم کے غار میں جا پڑوں ۔ افسوس افسوس! میرے فیروز کا خون ہوا ۔ اے فیروز ! فیروز ! فیروز !!! تیرا ایسا بد حال کن نے کیا ؟ (سر پٹک کر) اب کیسا دیکھوں ؟ کیسا دیکھوں ؟ کیسا برداشت کروں ؟ یہ جبرا[۴] ستم ۔ او جہنم میں گئی زندگی ، جہنم میں گئی خورشید ، الٹ ہوگئی دنیا ، سبھوں کا ستیاناس ہوگیا ۔ اے خدا ! کس لیے تو نے فیروز کو بلوالیا ؟ فیروز کہہ ، اب میں کیا کروں ؟ کہہ اب میں کدھر پناہ لوں ؟ کہہ اب کس طرح سے جی نکال دوں ؟ (بوسہ لے کر) اب کوئی مجھے بھی خدا کاٹ ڈالو ۔ فیروز ! اب میں مرتی ہوں ، مرتی ! مرتی ۔

[بے ہوش ہو کے کوتوال کے بدن پرگرتی ہے اورجہاندار شاہ کی بیٹی گل چھر شکاری کے پوشاک میں تیر و کمان لٹکائی ہوئی اپنی سہیلیوں کے ساتھ داخل ہوتی ہے]

گل چہر : اے دل آرام ! تیرے درمیان آنے سے میری نظر چوک گئی - نہیں تو اسی وقت اس ہرن کو جیتا پکڑ لیتی تھی - بہن ! تیرے آنے سے میں نے ایک اچھا بدلہ کھویا ، تجھے معلوم ہے کہ ایسا شکار پکڑ لے جانے میں اپنے والد سے اپن کو کتنا بڑا انعام ملتا ، اور بھی تمام شہزادوں میں اپنی بہادری آشکارا ہوتی -

دل آرام : بہن گل‌چہر! اس میں میری کچھ قصور نہیں ، میں تو سمجھی کہ تیرا ارادہ تیر سے بدھنے کا ہوتا -

داسی : واری جاؤں تم دونوں پر ، کیسی آپ کی خوبی - آپ کے لہو کے تیر نخچیروں کا شکار کرتے ہیں اور تمھارے پلک کے تیر تو بھلے بھلے شہزادوں کا دل فگار کرتے ہیں -

گل چہر : (دور نظر کرکے) دوڑو دوڑو! ابھی وہ ہرن باورا بن کر ادھر سے ادھر بھاگتا ہے ، چاروں اطراف گھیر لو ، میں بھی پیچھے آتی ہوں ، شتابی کرو -

[سب کوئی دوڑے ہیں، اتنے میں گل چہر کی نظر کوتوال کے پڑے ہوئے مردے اور خورشید پر پڑتی ہے]

دیکھو دیکھو یہ کیا ؟ یہ کیا ؟ (سب کوئی دوڑ کر آئے ہیں) کیسا عجب دکھاؤ - ایک سر بغیر کا دھڑ، اس پر ایک نوجوان خوبرو موا پڑا ہے - یہ کیسا طلسم، اس کی سمجھ کیونکر پڑے ؟ کس سنگدل نے ایسے نوجوان آفتاب سمان کا جی لیا ہوگا ! ارے یہ جوان موا پڑا ہے ، تو بھی اس کا رونق بخش چہرہ ، اپنی محبت کا تیر ، موت کے فرش پر سے میرے جگر پر

مارتا ہے ۔ لیکن صبر ! (خورشید کے بدن پر ہاتھ لگا کر) ارے یہ جیتا ہے ! فقط بے ہوشی میں ہے ۔

دایا : نیک بخت بانو ! ایک اور بھی عجائبی ۔ آپ کی انگوٹھی اس کی انگلی میں ہے ۔

گل چہر : یہ بھید کیسا سمجھ میں آئے ! اس طلسمات عجیب کی حالت سے حیران ہوں ۔ تب کیا میری انگوٹھی ان نے چوری ہوگی ۔ یہ دیکھنے میں تو کوئی بڑا شہزادہ معلوم ہوتا ہے ، اس کی انگلیوں میں اپنی انگوٹھی ڈالوں ، اس کو تو پہلے ہی قدرت پہنا چکی ہے ، ابھی تو الگ اٹھا کے شتاب اس کو اپنے مقام پر لے چلو کہ گلاب کے عطر کی باس سے اسے ہوش میں لاویں ۔ سنبھال کر اٹھانا ۔ کوئی عجائب غرائب بات ہے ۔

[سب آہستہ سے خورشید کو اٹھا کر لے جاتے ہیں]

———

پردہ چوتھا

ایک چوگان[1]

[فیروز فقیری حال میں داخل ہوتا ہے]

وز : اب اس محبت کا سخت مرض کس کے حضور ظاہر کروں ؟ اے خورشید ! دنیا کے سبھوں میں کنگال آدم جو دیکھنا ہو تو یہاں دیکھ لے ۔ میں حیاتی کی گھڑی کے آخری کنارے پر آ رہا ہوں ۔ جو گھڑی جاتی ہے وہ نیستی کے دریا میں جھپلا[2] دینے کی ہے ۔ ارے تو بوجھ کہ تنہائی کی رات ، ہائے افسوس کے ساتھ جھراپے میں کیسی کاٹتا ہوں ۔ اے خورشید ! پیاری معشوق ! تو اس طرح سے مجھے سرگردان ہونے نہ دے مگر جلد آ پہنچ کہ ایک مہربان فرشتے کے موافق اپنے پانکھ[3] کا چھاتا[4] میرے کم نصیب سر پر دھر اور میرے سینے پر اپنا رنٹھان[5] کر اور وہاں جو نا امید کی سردی جمع ہوئی ہے ، اسے نکال کے دلاسے اور دلبری کی گرمی بھر ! اے بد زمانہ ! تو کیسا کیسا ستم مجھے بتاتا ہے ۔

مرا جان جاتا ہے یارو سنبھالو
کلیجے میں کانٹا گرا ہے نکالو

نہ بھاتی مجھے زندگانی نہ بھاتی
مجھے مار ڈالو ، مجھے مار ڈالو

[فیروز بیٹھ جاتا ہے ، اتنے میں ملک شاہ فیر کے لباس میں
آ بیٹھتا ہے]

ملک شاہ : ارے ارے خورشید! تو نے مجھے مار ڈالا ! تو نے مجھے مار ڈالا ! تو نے میرا خانہ خراب کر ڈالا ! تیرے لیے شب و روز نا چار اور بے قرار بھٹکتا ہوں ، ساری دنیا ڈھونڈ ماری مگر تو کہاں چھپی بیٹھی ہے -

گانا

ارے افسوس ! وہ یارِ ستم گر
گئی اب بے مروت مجھ سے ہو کر
نکل بھاگی وہ کارو میرے فن سے
گئی اب شیرینی میرے دہن سے
وہ یار اب ہاتھ سے میرے گیا رے
شکار اب ہاتھ سے میرے گیا رے
وہ تدبیروں کا سارا تار ٹوٹا
مرے ہاتھوں سے وہ شہباز چھوٹا

[ملک شاہ فیروز کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور غازی خاں
فقیری پوشاک میں داخل ہوتا ہے]

غازی خاں : آدم کی زندگی کے دریا میں ایک ہی ویلا[۹] بھاری بھرتی ہوئی ہے ، جو اسی وقت اس کو پکڑ لی تو تمام بے مول گوہر نظر کے پاس وہ دھرتی ہے ، اگر ہاتھ سے گنوائی تو عمر بھر کھر بھرے کھڑک[۷] میں اور کیچڑ کے کھاڈے[۸] میں وہ پھنسا رہتا ہے - ارے رے

میری زندگی کی بھرتی کو اپنی لائی سے میں نے کھودی،
اب منہ کھولتا رہ گیا ، ارے میں ایک سدھان چور
ہونے کے ساتھ ایک عورت کے ہاتھ چورا گیا - میں
خود بھاری ٹھگ اور آخر ایک بڑبی سے ٹھگا گیا !
افسوس !افسوس !

[غازی اس دونوں کے نزدیک بیٹھا ہے اور جہانگیر و
جہاں بخش فقیری حال سے داخل ہوتے ہیں]

گانا

لگیر : (چلتا چلتا)
روپا لاگا پنکھی پنجرا چھوڑا

ں بخش : (چلتا چلتا)
میری زندگی کا ارے دھاگا توڑا

لگیر : جھمک بتا کے نکل گئی پری

اں بخش : رہیں میری اکھیاں تو آنسا بھری

انگیر : محبت کا فرشتہ ٹھگا کے گیا

اں بخش : میری زلدگانی ڈوبا کے گیا

انگیر : گئی ماہ رخسار یاں سے نکل

اں بخش : گئی مری زندگی کی امید پگھل

ہانگیر : ترے پیچھے لیا ہے فقیری حال
(بیٹھتا ہے)

ہاں بخش : مؤا تک نہ چھوڑوں گا تیری وصال
(بیٹھتا ہے)

جہانگیر : گانا[۱]

تیرے در پہ ہم آکے پڑے ہیں صنم
نہ سفر کے رہے ، نہ وطن کے ہوئے

جہاں بخش :

ترے ہجر میں بانیِ ظلم و ستم
نہ قبر کے رہے ، نہ کفن کے ہوئے

ملک شاہ :

تری الفتِ سرد سے اے دلبر
گرے چشم کی راہ سے لختِ جگر

غازی :

رہے روتے صدا نادیدۂ نم
نہ شرر کے رہے ، نہ جلن کے ہوئے

فیروز :

دمِ صبح جو آیا ہے بادہ بہ جوش
یاد آتا صنم کا ہمہ گوش (کذا)

ہوئے ہجر میں رو رو کے ہم بیدم
نہ خبر کے رہے نہ سخن کے ہوئے

[سب جاتے ہیں]

---

۱ - فقیر لوگوں کے راگ میں (اضافۂ مترجم) ۔

باب چوتھا

پردہ پانچواں

جہاں دار شاہ کا محل ، مقام فیض آباد

[خورشید بے ہوش پڑی ہے اور گل چہر اس کے نزدیک انتظار کھڑی ہے]

گل چہر : ارے یہ خوب نما درخت برداشت کیا نہ جاوے ۔ ایسا درد کے بھاری طوفان سے کیسا مرجھا گیا ہے ۔ لیکن شکر خدا کہ ہنوز زندگی کا گرم رس اس کی شاخوں میں باقی ہے ۔ جنگل سے میں اس کو یہاں لائی ۔ تب سے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرتی ہوں ، لیکن اب تک کچھ حاصل نہیں ۔ (کچھ دوا لگاتی ہے) خوب صورتی ! خوب صورتی ! او نیند کے اندھکارے میں جنگھی ہوئی خوبصورتی ! تجھ پر فدا ، تیرے بنانے والے پر فدا ، اس پیشانی پر فدا ، ان چشموں پر فدا ، یہ لال لب ، یہ گلابی رخسارے ، یہ گرہ دار ابرو اور یہ جوان گبھرو کے اوپر دل جان سے فدا ہو گئی ہوں ۔ (پیار اور ناصبری سے خورشید کا بوسہ لے کر) اٹھ اٹھ ! اے جنگل میں سے جھمک دینے والا جواہر ! اس جھورتے جان میں جڑا کے کر مجھے جلا دار ۔ میرے ساتھ شادی سے کر وصال اور اس

بن 'پتیا'[3] محل میں آبادی کر ڈال (بغل گیری کرتی ہے)۔
آہا ! اس میں گرمی موجود ہے لیکن مجھے جلاتی نہیں ،
بلبل حاضر ہے لیکن سرود بھرا سخن نکالتا نہیں ،
شکاری حیات ہے لیکن تیر پھینکتا نہیں ۔ او 'تو نہیں
اٹھے گا ، ایک ہی آخری علاج ہے ، یہ تیز دوا
سنگھاتی ہوں ، اگر اس سے بھی نہیں اٹھا تو یہ پیار،
جان خوار ، یہ دلدار معشوق خوار، میرے راج تاج
اور ساجھ کا ساتھی خوار، اس کے دکھ میں دکھیاری
گل خوار۔ (خورشید کو شیشی سنگھاتی ہے اور خورشید
جھڑپ سے پکار اٹھتی ہے ، اور گل پھر وہاں سے ہٹ
جاتی ہے) ۔

خورشید : (آس پاس دیکھ کر) کیا بادشاہی محل ! عطر
کستوری کا سواس جنگل ہوتا ! سو محل ہو گیا ۔ کیا
ملک شاہ کے دریائی محل میں پھر میں قید ہوئی
یا فتوری فتح شاہ کے حرام حرم خانے میں پھر آپڑی؟
(آس پاس دیکھ کر) ارے ! یہ کوئی نیا محل ہے
یا بے فام[4] مغز کا کوئی خالی کھیل ہے ؟ جیوں
قتل ہوا مرد میرا فیروز ہے یا نہیں ، وہ میں
بہ خاطری کہہ نہیں سکتی ہوں ۔ ویسا ہی یہ ہو بہو
محل ہے یا نہیں ، وہ بھی یقین سے کہہ سکتی نہیں ۔
نہیں نہیں ، یہ سب اثر خواب کا ہے ۔

[پھر سو جاتی ہے]

باب پانچواں

پردہ پہلا

فیض آباد میں جہاندار شاہ کا محل

[گل‌چہر اور جہاندار شاہ (موجود ہیں۱)]

جہاندار: نور چشم بیٹی! وہ تیمور جس کو شکار گاہ سے تو اٹھا لائی ہے، وہ کوئی براج۲ چالاک اور خبردار معلوم ہوتا ہے۔ آج وہ دربار میں آ بیٹھا تو اس کی شان و شوکت اور فہم و فراست دیکھ کر تمام امیر امرا خوشنود ہوگئے۔ بڑے بڑے عالموں کے ساتھ ایسی تقریر اور حجت اس نے چلائی کہ سبھوں نے حیرت سے انگلیاں منہ میں ڈالیں اور سب مجلس نے ایک آواز سے اس کو میرے وزیر کی جگہ دینے کی درخواست کی، تو پھر میں نے بھی ان کو بحال رکھا۔

گل چہر: بزرگوار پدر! آپ کی کی ہوئی اس قائمی۳ سے میں بہ جان و دل خوش ہوئی ہوں اور آپ کا بڑا احسان بوجھتی ہوں۔ جنگل باسی، بن سر کے مردے پر گرے ہوئے ایک نوجوان کو میں اٹھا لائی تو سبب اس کا محبت ہے۔ جب اس کا نورمند چہرہ چشموں پر پڑا تو میں دیوانی سی ہو گئی ہوں، اس کا

جنگل میں آنا کس لیے ہوا ہے ، اس سے میں بالکل
ناواقف ہوں ۔ نام اور باپ! اس کی مہر نے میرے
دل میں ایسا تو چھاپ لگایا ہے کہ میں اسے ایک
پل بھر بھی بھولتی نہیں ۔

جہاندار : عزیز بیٹی ! تیرے مقصودِ دل سے میں واقف ہوچکا
ہوں ، اب تُو خوش ہو ، میری تینوں بیٹیوں میں تُو
بڑی ہے اور میرے تخت کی وارث بھی تُو ہی ہے ۔
بد نصیب اپنا کہ مجھ سے آزردہ ہو کر تیرا بھائی
دولت خاں گم ہو گیا ہے اور تیرا دلدار بہادر خاں
بھی نکل گیا ہے ، تو اب جو تُو بادشاہی حشمت
والے تیمور پر فدا ہے تو مجھے بھی لازم ہے کہ تیرا
نکاح وہ خوش خلق مرد کے ساتھ کردوں اور دونوں
کو اپنا جانشین کروں ۔ دیکھ! سامنے سے تیری خوشی
کا آفتاب طلوع ہوتا ہے ۔

[جاتا ہے]

گل چہر : آہ ! میری امید جلدی حاصل ہوگی ۔ تیمور مرد ہے
اور اتنا خوب نما ہے ۔ اگر وہ عورت ہوتی تو سارے
جہاں کو جھراپے سے جلاتی ۔ بڑی قسمت میری کہ
بے مول ہیرا مجھے ملا ۔

[خورشید مرد کے پوشاک میں داخل ہوتی ہے ، (گل چہر)
اس کو گلے لگا کر]

پیارا ایک نظر سے دیکھتے ہی پسند کیا ۔ بڑی شکتی
سے جیتا کیا ، عزت کے ساتھ نامدار وزیر کا بڑا عہدہ
عنایت کیا ، تو اے جان! اب مبارک بھری شادی کے
پیوند سے خوش حالی کے تخت پر بیٹھ اور مجھے بٹھا ۔

خورشید : (دل میں) ارے بن تقصیر بانو! تجھے کہاں سے خبر کہ میں ایک عورت ہوں ۔ (گل کو) اے شمع رو شاہ زادی ! مجھ سے ایک مسکین پر تجھ سی شہزادی فدا اور میرے ساتھ پیوند کرنے کی آرزو ! ایسا کیوں کر ہو؟ تیرا نامور پدر قبول کیسے رکھے !

گل چہر : جان ! اس کا اندیشہ مت کر ۔ مہربان پدر کی اس میں خوشنودی اور راضی پائی ہوں ۔ سن ! میرے باپ کی پشت سے ہم تین بیٹیاں ہیں اور دولت خاں نام ایک بیٹا تھا ۔ دولت خاں آج مدت ہوئی یہاں سے بدر ہوا ہے اور خدا معلوم کہاں گم ہوا ۔ تینوں بہنوں میں میں پہلی ہوں ، تخت کی وارث اور حقدار جانشین میں ہوں ، اس لیے پدر کی خواہش ہے کہ تو نامور کے ساتھ نکاح کر ، راج و تاج کی مالک ہوں ۔ میں بڑی قسمت دار کہ تجھ سا ایک خوبرو جوان اور صاحب حکمران پائی ۔ میری دونوں بہنیں آج غم کے غار میں پھنسی ہوئی ہیں ، کیونکہ تھوڑی سی مدت پر نزدیک کے بیابان میں واسطے سیر کے گئی تھی ، وہاں یک بیک آنکھ ان نازنینوں کی کسی شہنشاہی تاب والے دو جوانوں سے لڑی اور انھیں دیکھتے ہی عاشق دل ہوگئیں ۔ ملاقات کے بعد وہ جوان وہاں سے نکل گئے ، ان کی بہت سی جستجو کی مگر پھر انھیں پایا نہیں ۔ اس جدائی سے وہ دونوں شب و روز دل دردمند ہیں، لیکن قسمت میرا بلندی کے برج پر آیا کہ تجھ سا ستارہ تابناک ہوا ، تو پھر میں اس کی روشنی سے کیونکر بہرہ مند نہ ہوں ؟

[خورشید کا بوسہ لیتی ہے]

خورشید : (دل میں) اس پاجی زمانے کی کیسی گردش ہے ! جب اُلجھنوں کے پنجے سے رہائی پانے کے لیے لباسِ مردانہ لیا تب مجھے آج اس نیا پھانسا میں لا کر پھنسائی ۔ اب اس کے ساتھ کون سی ازی کھیلوں ؟ توبہ ! ہم دونوں عورت ہیں تو باہم شادی کیسے کی جائے ؟

گل چہر : (دل میں) تھوڑے تھوڑے میں ان کا گلابی رخسار کیسا برمردہ ہو جاتا ہے ۔ بے چارا کوئی دکھ کے بھاری دریا میں غوطہ کھاتا ہے ، نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کون سرد دل مرد ہے ۔ سچ کوئی شہنشاہی فرزند ہے ۔ (خورشید کو) اے جان من ! اب کیا دریافت کرتا ہے ؟

خورشید : مہربان ، روشن بیان نازنین ! تیری محبت بھری نوازش سے میں شرمسار ہوں لیکن اب مجھ سے شادی کی نہ جائے گی ۔ تُو نے اپنی نظروں سے دیکھا ہے کہ اس بیابان میں میں کون سی حالت میں پڑا ہوا تھا ۔ کیا کہوں ، میں اور میرا ایک جان و دل دوست شکار کے لیے دور سے اس جنگل میں آپہنچا تھا ۔ ایک شکار کے پیچھے میں لگا ، وہاں سے پھر کر میں آیا تو افسوس میرے آشنائے دل کا سر دھڑ سے ٹوٹا دیکھا ۔ اس کو دیکھتے ہی میں بے خود ہو گیا ، وہاں سے تُو مہربان مجھے اِدھر لائی ۔ اس نامدار جگر یار کا غم میرے دل پر تازہ ہے ، اس لیے میں کسی بھی رنگ و رس میں شامل ہونے والا نہیں ہوں ۔ مگر

تو نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے اور میں اس تیرے
حسنِ دلربا پر قربان ہوں ، تو تُو تھوڑی سی ڈھیل
دھر، بعد از چہار ماہ کے میں تجھ سے پیوند کروں گا ،
تُو اپنے پدر کو میری حقیقت سے واقف کرنا ۔

ل چہر : اے میری حیاتی کا آدھار ! تجھے آزردہ دیکھ ، میں
غمگین ہوں ۔ اگر تُو اب نکاح کرنے میں راضی نہیں
تو کچھ پروا نہیں ، چہار ماہ آسان سے کٹ جاوے
گا ۔ اپنا ملاپ تو نزدیک ہے ۔ جان ! اب میں تیرے
لیے نعمت کا سفرہ بچھانے کو جاتی ہوں ۔

[جاتی ہے]

ورشید : اب کیسی تدبیر کروں ؟ فیروز زندہ ہے یا نہیں ،
اس کی خاطری کس طرح سے ہووے ؟ جی گھابرا
ہو رہا ہے ۔ یا الٰہی ! تُو موت دے کر مجھے چھڑاتا
کیوں نہیں ؟ کیا فیروز ہنوز حیات ہے ؟ کیا اس کے
ملاپ کے لیے مجھے تُو نے جیتی رکھی ہے ؟ ارے
وہ دن کب ہاتھ آوے ؟ اب علاج تو ایک ہی نظر
آتا ہے کہ میں نے جو اپنی ہو بہو ایک صورت اصلی
لباس میں نقاش کرائی ہے ، اس کو اپنے محل کی
کھڑکی پر لٹکا رکھوں ۔ اگر اللہ کی مہر سے فیروز
جیتا ہوگا اور کوئی دفعہ یہاں آپہنچے گا تو اس تصویر
کو دیکھ کر میری تلاش کرے گا ۔ اب مجھ میں تو
اس کی تفحّص کرنے کی کچھ طاقت رہی نہیں ہے ۔
بہتے پانی کے مانند چہار ماہ کی مدت تمام ہوئے گی ،

اتنے میں اگر خداوند نے مجھ پر کچھ مہر نہ کی تو
بس آخر یہ جان برباد کروں گی یا اپنا سب راز کھول
کر جوگن بنوں گی ۔

[جاتی ہے]

باب پانچواں

پردہ دوسرا

[محل کی کھڑکی پر خورشید کی تصویر لٹکائی ہے ،
فقیر کے لباس میں فیروز داخل ہوتا ہے]

فیروز : ارے اس دیوانہ ہوا دماغ مجھے پھراتا پھراتا کہاں لے کر آیا ! ارے میری تولدگاہ یہی ، میرے دادے کا محل یہی ، میں یہی جگہ میں پرورش ہوا ، لاڈ کا لڑکا اگر خدا نخواستہ میرا پدر بہشت نشیں ہوا ہوگا تو اس شہر کا شاہ آج خود میں ہوں ، لیکن کس کو خبر ہے کہ میں جہاندار شاہ کا بیٹا دولت خاں ہوں ۔ کس کو خبر ہے کہ تینوں بہنوں کے بیچ میں ، ایک ناز بھرا بھائی ہوں ۔ مہربان خورشید ! یہ سب تجھ کو جتانے کی ایک بار امید تھی مگر وہ امید بر آنے سے پہلے تو نے میرا ایسا بد حال بنایا ۔

[اتنے میں محل کی کھڑکی میں لٹکی ہوئی تصویر پر نظر جاتی ہے ۔ اس کو دیکھتے ہی چمکتا ہے]

نہیں ! یہ کیا ؟ خود خورشید کی صورت ! یہاں اس مبارک صورت کہاں سے ؟ خورشید یہاں آوے ؟ ارے تب تو میں اس زندگی میں سب سے قسمت دار آدمی بنوں ۔ اب اس کی چرچا کرنے کی یا اس دروازے

میں جانے کی ہمت کہاں سے کروں ۔ خدا جانے میرے پدر کا غصہ سا گیا ہوگا یا نہیں ۔ جو خادم میری پرستش کرتے تھے ، وہی ابھی دھکے مار مجھے باہر نکالیں گے ۔ اب یہاں بیٹھ کر دیکھوں تماشا آسمان کا ، یا تو اس مبارک تصویر کے سامنے مرنا ، یا اس کی رمز بات کا پتا ملانا ۔

[بیٹھتا ہے اور ملک شاہ فقیر کے لباس میں داخل ہوتا ہے]

ملک شاہ : (محل کی طرف دیکھتے ہی چونک کر) ہا ! یہ تصویر مرے معشوق کی ! او جان ! او جگر ! تُو یہاں کہاں سے ؟

فیروز : (عجائبی سے ملک کو) اے دوست ! کس لیے اس صورت کو دیکھنے سے تجھے اتنا تعجب ہوتا ہے ؟

ملک شاہ : میری مصیبت کا سنگھوتی، جس کے لیے بادشاہی چھوڑ اس بد حالت میں گرا ہوں ، وہ نازنین کی یہ تصویر یہی ہے ۔

فیروز : تیری نازنین کا نام کیا ہوتا ؟

ملک شاہ : خورشید پیکر ! خورشید نام اس کا تھا ۔

فیروز : خورشید ! اے بیوقوف ! یہ جگر توڑ نام تُو نے کیوں لیا ؟ کیا تو میرا ٹھٹھا کرتا ہے کیا ؟ میں اِسی کا زخمی، میں اِسی کا دیوانہ عاشق ، میں اِسی کا حق‌دار خاولد ۔

ملک شاہ : اے نادان ! یہ کیا بکواس کرتا ہے ؟ خاموش رہ خاموش ! اگر نہیں تو میرے ہاتھ سے مار کھا جائے گا ۔

فیروز : اے بے ہوش ! تُو کون سا گمان رکھتا ہے ؟ اگر جو پھر اس نازنین کا مبارک نام اپنی عاصی زبان پر لایا

تو یہ تیری زبان جھٹ کاٹ لوں گا ۔

ملک شاہ : کیا موت سے مدہوش ہوا ہے کیا ؟ دیوانا دور ہو یہاں سے ، نہیں تو جوتی مار نکالوں گا ۔

فیروز : جوتی مارے گا ؟ ناپاک چور ! تیرا سر توڑ ڈالوں گا ۔

[دونوں جھگڑتے ہیں ، اتنے میں بابک آتا ہے]

بابک : اے برادرو ! کس لیے جھگڑ مرتے ہو ؟ کیا اب تک کچھ فضیحتی باقی رہی ہے کہ یہ لیا تماشا لگایا ؟

فیروز : دیکھ بھائی ! یہ ناپاک میری عزیز جان خورشید کو لوٹنے منگتا ۔

ملک شاہ : اس لُچے کا سر توڑ کے دکھاؤں گا کہ پھر میرے سامنے بے ادبی نہ کرے ۔

بابک : تم دونوں دیوانے ہو ۔ تمھاری غب شب میرے دماغ میں آتی نہیں ۔

ملک شاہ : میں دیوانا ؟ تیرا باپ دیوانا ! کم ذات چور !

بابک : میں کم ذات ؟ اے موذی ! (جھگڑتا ہے)

[جہاں بخش اور جہانگیر داخل ہوتے ہیں]

جہاں بخش : یہ خانہ خراب کوئی خراج[۲] رذیلے ہیں ۔

جہانگیر : ارے ہم شاہی تخم رکھنے والے بادشاہ کے فرزند ، آج کون نیچ آدمیوں کے سنگ یک رنگ ہو گئے ہیں ۔ (اونچے دیکھتے ہی) ارے دیکھ دیکھ ! میری معشوق تو یہاں کھڑکی پر چڑھ کے بیٹھی ہے ۔

جہاں بخش : پھر تُو زبان سنبھال ! یہ تیری نہیں ، میری دلربا معشوق ۔ (بانگِ بلند سے) اے دلربا معشوق ! یہاں کہاں سے تُو آ بیٹھی ؟

فیروز : (چونک کر) چپ چپ! تیرا کیا مقدور کہ تو اس پر عاشقی کا دعویٰ کرے؟

جہاں بخش : اے دیوانہ! تو یہ بات نہیں سمجھے، خاموش رہ!

فیروز : اے احمق! جو میری دلدار، اس کی بات میں نہیں سمجھوں؟

جہانگیر : چل چل، دلدار کا دعویٰ کرنے کو آیا ہے، اس کی پیزار بھی تجھے نہ ملے گی، یہ دل آزار تو میری ہے۔

فیروز : اے گدھے! کیا بکتا ہے؟ کس کی مسخری کرتا ہے؟ (مارتا ہے) جان جانے دوں مگر نام اس کا نہیں....

جہاں بخش : کہاں سے ایسے رذیلے آدمیوں ایک شہزادی کا دعویٰ کرنے کو آیا ہے؟ ایک رذالہ ہے، ایک پنجارہ[۳] ہے اور ایک نیچ ہے۔

ملک شاہ : میں رذالہ؟ (ٹھونسا لگاتا ہے)۔

بابک : اے دیوانے! کیا مجھے بھی نیچ کہتا ہے؟ میں کون ہوں؟

[سب کوئی آپس میں لڑتے ہیں، بابک کو زمین پر ڈال کر جہانگیر مارتا ہے، شور و گونگا[۴] ہو رہا ہے۔ خورشید کھڑکی کی بڑ[۵] سے ناصبر ہوکر دیکھتی ہے۔ سپاہی (مع چوبدار[۶]) آتے ہیں]

چوبدار : اے بے شرم فقیرو! تم لوگ راہ کے درمیان کس لیے

اتنا گونگا مجاتے ہو؟ چلو تم کو ہمارا نام دار وزیر بلاتا ہے۔

فیروز: بابا! تیرے وزیر کے ساتھ ہم کو کچھ کام نہیں ہے۔

[سب کوئی حجت کرتا ہے، سپاہی ان کو دھکے مار، لے جاتا ہے]

باب پانچواں

پردہ تیسرا

گل چہر کا دیوان خانہ

[خورشید مرد کے لباس میں بیٹھی ہے]

خورشید : قسمت کا بند ہوا دروازہ آج کھلا ہونے کی کچھ بشارت ہوئی ہے۔ اس فقیروں میں سے ایک تو میرا فیروز شاہ نظر آتا ہے ، ایک وہ ملک شاہ نما ہوتا ہے ، ایک وہ چور جیسا ، اور وہ دو جوانوں میں سے جنگل میں ملا ہوا شکاری کی نشان معلوم ہوتی ہے۔ لیکن خدا داند انھیں گمان کیا ہوا ہے ، یا کوئی دوسرا۔ دیکھیے پوچھ پاچھ کرنے سے اور نزدیک آنے کے بعد زیادہ خلاصہ ہوگا۔

[فقیر داخل ہوتے ہیں]

بھلے سادھوؤ ! تم لوگ کس لیے جھگڑتے ہو ؟ آپس میں کون سا مناقشہ ہے ؟

فیروز : (خورشید کو) بزرگ وزیر ! میں کوئی سچا سادھو نہیں ہوں ، لیکن میری عزیز معشوق کے گم ہونے سے اس پر جوگی پنا میں نے اختیار کیا ہے ، اور وہ معشوق پر یہ لچا دعویٰ کرتا ہے۔

خورشید : (دل میں) معشوق کے گم ہونے سے "
ملک شاہ : نامدار صاحب ! یہ شخص گلے پڑو ہے - جو معشوق
میری ہے ، اس کے نام سے ایک ملتا ہوا نام اس کی
کوئی ایسی ہی جورو کا ہوگا - وہ منّے سے ناحق
میرے ساتھ جنگ مچاتا ہے -
خورشید : (فیروز سے) بھائی ! تیری عورت کا نام کیا ہوتا ؟
فیروز : خورشید ! اور اسے یہ ناپاک لینے کو منگتا ہے -
خورشید : (چونک کر دل میں) خورشید ! یہ کیسا معجزہ !
بے شک یہی فیروز - (گلے لگنے کو چاہتی ہے لیکن
صبر --- ملک کو) اس عورت پر آپ کا کون سا
دعویٰ ہے ؟
ملک : نیک مرد ! آپ کے محل کی کھڑکی پر جو تصویر
لٹکائی ہے ، وہ میری خورشید کی ہوبہو شکل رکھتی
ہے - میں نے اس کو خرید کی تھی اور اپنے دریائی
محل میں رکھی تھی -
فیروز : (چڑ سے) تب اے دغل باز ! تو نے ہی دغا سے
میری انگوٹھی لے کر ، مجھے ٹھگا کر ، اس حالِ تباہ
پر پہنچایا ، نہیں ! ابھی میں سمجھا ، تو ہی وہ ناپاک
ملک (اس کا گلا پکڑنے کو جاتا ہے ، سپاہی اس کو
اٹکاتا ہے) -
خورشید : (بابک کو) تیری کیا فریاد ہے ؟
بابک : صاحب من ! راستی رضائے خدا است - میرے دعوے
کے پاؤں کم قوت ہیں ، ایک خوب چہر عورت کو ،
اگر یہ ملک شاہ ہووے تو ، اس کے محل کی کھڑکی
پر سے ، اس کا خاوند سویا تھا ، اتنے میں میں چرا لیا ،

مگر چور کے منہ پر آخر بیزار ، تو مجھے وہ عورت ٹھگا اور جگر میں زخم لگا کر خدا معلوم کہاں نکل گئی - ابھی میں اس کی تلاش میں یہ حال تباہ پھرتا ہوں -

فیروز : اے بد بخت چور ! میری خورشید ، میرا گھوڑا اور گٹھڑی چھین لینے والا تو ہی ناپاک ؟ ارے کم ذات ! دوسری دفع بد حال کرنار[1] تو ہی ؟

[مارتا ہے اور سپاہی اٹکاتا ہے]

خورشید : (دل میں) ارے یہ کیسا بناؤ[2] واقعہ ؟ تب فیروز کے لباس میں پڑا ہوا مردہ کون ہوگا ؟ اس کی کچھ سمجھ پڑے - (جہانگیر اور جہاں بخش کو) برادرو ! آپ کون ہو اور کون سی مصیبت میں ہو ؟

جہانگیر : صاحب ! ہم دونوں بھائی ہیں - ہماری حکایت سے کم واقف ہونا بہتر ہے - اتنا اشارہ بس ہوگا کہ ہمارا حسب نسب عالی ہے لیکن مارے حادثے کے جنگل باسی ہوئے تھے- ناگاہ ایک خوب چہرہ نازنین کا وہاں گزر ہوا ، اس پر ہم دونوں بہ دل عاشق ہوئے مگر وہ پری ہم کو ٹھگا کے نکل گئی - اس کے غم میں گرفتار ہو کر ہم پھرتے تھے - اتنے میں اسی کی عین صورت ، اس ڈیوڑھی کے دروازے پر دیکھنے میں آئی - اور دیکھوں کیا کہ اس پر تو ایک یہ ایک کا دعویٰ ہے -

فیروز : ارے یہ کیسا جھگڑا[3] ! میرا ستیاناس بنانے والی چنڈال چوکڑی تو میرے ہی پیچھے بھتی[4] تھی -

کلیجہ کاٹنے والے میرے درد کے ساتھی تھے ۔ آ ہا !
سب بھرم کھلا ہو گیا ۔

خورشید : برادرو ! تمھاری بات دکھ بھری ہے لیکن میرے پاس
چند مدت ہوئی ایک عورت نے پناہ لی ہے ، وہ بہت
ہی حسین اور خوبصورت ہے ۔ اس کا درد کچھ تم
لوگوں کے احوال کے ساتھ مناسب آتا ہے ، اس لیے
میں اسے تمھارے حضور حاضر کرتا ہوں ، پھر پہچانو
وہی تمھاری معشوق ہے یا نہیں ۔ ابھی سو جاؤ ، ذرا
آسائش کرو ۔ (نفر کو) ان مردوں کو حمام خانے
میں لے جا کے صاف پوشاک دے اور نعمت خوراک
دیے تندرست کر اور پھر یہاں لا ۔

[سب کو لے جاتا ہے]

(دوزانو بیٹھ کر) اے صاحب قدر دان ! تو آخر ہوا
مجھ پر مہربان کہ دریائے دکھ سے چھڑایا تو نے
یہ جان ۔ اب میں جا کے شتاب قدیم خورشید بنوں ،
خود عورت کا لباس پھر حاصل کر کے گل چہر کو
نا سپاس اور فیروز کو پُر آس کروں ۔

[جاتی ہے]

باب پانچواں

پردہ چوتھا

ایک محلہ

[بہادر خاں اور ہمایوں شاہ (موجود ہیں[1])]

ہمایوں : بھلے مرد ! دنیا کی ہمہ نعمت میں حاصل کر چکا ہوں ۔ سچ کہتا ہوں کہ ویسی تُو نے اور تیرے باپ دادا نے تو کیا پر نیم جہان نے بھی حاصل کی نہ ہوگی ۔ اور جو چیزوں کی لذت انھوں نے کبھی لی نہ ہوگی ، وہ سب سے میں بہرہ ور ہوں ۔ راج و تاج ، گنج و گوہر ، ان سب چیزوں کا مالک ہو چکا ہوں ، مگر آج یہ تمام کو تج کر ، کسی رازِ نہاں سے یہ ڈھب اختیار کر کے ، شہر بہ شہر پھرتا ہوں ۔ اگر میری چھپی امید ہاتھ آوے گی تو زندگی میں پھر مراد کا پھل چکھوں گا ، نہیں تو اب نک تھاک[2] سے ، رنج سے اور بھوک سے یہ جان بسمل ہو رہی ہے ۔ اس کو اسی بری حالت میں یہ فریبی دنیا سے اٹھا کر چلا جاؤں گا ۔ (دل میں) یہ شہر میرے نام دار برادر جہاندار کا ہے لیکن آج کون کہہ سکے گا کہ اس کا جاہ و جلال برادر ہمایوں میں خود ہوں جو اپنے بیٹوں کی آوارگی کے غم میں گرفتار پھرتا ہے ۔

چاکر[۳] : (دل میں) اگر تو شاہ ہوگا تو میں بھی وزیر زادہ ہوں ۔
آج اس حالت میں آوارہ ہوں تو کیا ، ہر شاہوں کے
ندیم اور دستور تاج میرے باپ دادا تھے ۔ (ہمایوں
سے) بزرگوار مرد ! میں بھی کستال[۴] گیا ہوں ، تو چل
اس محل میں ، یہاں مسافروں کی اچھی پرداخت
ہوتی ہے ۔ جا کے کچھ آسائش ہووے ۔ (دل میں) ارے
یہی میری بچگی کی پناہ گاہ ۔

[جاتے ہیں[۵]]

باب پانچواں

پردہ پانچواں

جہاندار شاہ کا دیوان خانہ

[گل چہر ، امیر امرا رونق بخش ہیں - فیروز ملک ، جہانگیر -
جہاں بخش ، بابک اچھی پوشاک میں بیٹھے ہیں -
رامش گریں گاتی ہیں]

رامش گریں : **گانا**[1]

کسی سے پریت نہیں کرے ڈرے بھلا اس جگ میں
——کسی سے

اس جگ میں جیون تھورو[2] کاہے کو برائی سر لیجیے
بھلا اس جگ میں—— کسی سے

اپنی نہ کہیے واری اور کی نہ سنیے بن چاہے وا ان کو نام نہیں لیجے[3]
بھلا اس جگ میں—— کسی سے

گل چہر : نیک مردو ! جو آپ ستم رسید ، تو بھی آپ میں سے شرافت اور عالی نسب نمودار ہوتی ہے - (فیروز کو) اے جوان ! آپ کا چہرہ میری پہچان کا معلوم ہوتا ہے ، لیکن میں کہہ نہیں سکتی ہوں کہ کون شخص

---

۱ - راگ سوہنی -

کے چہرے کی یہ نقل ہے۔ کہو ! تمھارے پر کون سی آفت وارد ہوئی ہے ؟

فیروز : مہربان خاتون ! آپ کا وہ نامدار وزیر ہماری سب حقیقتوں سے واقف ہوچکا ہے۔ وہ تخت پناہ آپ کو تمام بیان سے عیاں کرے گا۔ میرے دردِ دل کا زیادہ احوال کہنے کی یہ جگہ نہیں ہے۔

گل چہر : جوبدار ! شتاب امیر خجستہ تدبیر، تیمور وزیر کو یہاں بلا !

[ایک سہیلی کے ساتھ عورت کے پوشاک میں منہ پر برقع ڈال کے خورشید داخل ہوتی ہے]

سہیلی : اے بیگانے مردو ! ہمارے نام آور وزیر نے تمھارے حضور اس دلربا عورت بھیجی ہے اور کہلایا ہے کہ غور سے دیکھ لینا کہ جس کے لیے تم شہر و شہر بھٹکتے ہو، وہ عورت یہی ہے یا نہیں۔

[خورسید اپنا برقع کھولتی ہے - فیروز اور دوسرے عاشق عجائبی سے دیکھتے ہیں]

فیروز : (بوم مار کر) او ! یہ میں کیا دیکھتا ہوں ' ن کا مبارک نام کیا ہے ؟

سہیلی : نام خورشید۔

فیروز : (گلے لگ کر) خورشید ! ہاں، سچ یہ خورشید۔ مہربان، عزیز جان خورشید ! بجاؤ کی بادلی میں چھپی ہوئی شیریں شہد خورشید !

خورشید : میرا روشن روز فیروز ! کیسا میٹھا ملاپ ! اب قسمت پھری۔ دکھ نے انجام پایا، یا رب العالمین ! باندھ لے ایک میں ایک کو لوہے کی زنجیر سے کہ پھر کسی سے چھوٹا کیا نہ جائے۔ (بلک رہتی ہے) -

ملک : (دل میں) افسوس! اب تو سب رازِ نہاں ظاہر ہو جائے گا ۔ اب کیا کروں ، اس نازنین پر میرا دعویٰ کیسے چلے گا ؟

جہاں بخش : (دل میں) میرا کچھ ہونے والا نہیں ، ان کی محبت اول سے جوڑی گئی ہے ۔

بابک : (دل میں) ارے میں اپنا تماشا کیونکر دیکھوں گا ؟ مجھے چور پہچانے گا اور سب کی جوتی میرے پر پڑے گی ۔ بچہ غازی ! آج تو مر گیا ۔

گل چہر : ارے میرا تیمور وزیر کہاں ہے ؟ جلدی بلائیو کہ اس بھید کا کچھ خلاصہ کرے ۔

[جہاندار شاہ داخل ہوتا ہے ، اس کے ساتھی ضعیف وزیر بھی ہے]

جہاندار : یہ کیا عجائب بات ہے ! بیٹی گل چہر ! تیرے حضور یہ کیا فساد ! یہ کون آدمی ہیں ؟

فیروز : (زمین بوس ہو کے) شرافت پناہ شاہ ! جو کچھ ہے ، سو فساد میرے سے برپا ہے ۔

جہاندار : تو کون مرد ہے اور کہاں کا باشندہ ؟

فیروز : قبلۂ عالم ! غور سے امتحان فرمانا کہ جناب کے محبت کی کچھ بھی نشان اس کم بخت کے چہرے سے نمودار ہوتی ہے ؟

جہاندار : کیا ؟ کون ! تیرا چہرہ ؟ ارے اس چہرے کا نقش میرے مغز پر قائم ہے ، یہ چہرے میں اکثر علامتیں پائی جاتی ہیں ۔ مگر اس کی پہچان کس سے ہووے ؟

فیروز : خداوند ! وہ پہچان آپ کا بندہ کرائے گا ۔ بزگوار

پدر ! میں وہی ناخلف و کم نصیب ہوں جو اتنی
مدت نحس ایام کے باعث سرگردان پھرا اور اس بارگاہ
سے محروم رہا ۔ اب دیکھ لو اپنا بیٹا دولت خاں ، آپ
کے قدم مبارک پر اپنی تقصیر کا عذر چاہتا بیٹھا ہے ۔

جہاندار : شکر خدا ! (بغل میں لیتا ہے) کیا میرا دولت خاں
پیارا بیٹا ! میرا جان افزا فرزند ! ارے تیرا یہ کیا
حال ؟ کیا حق تعالیٰ نے تجھے دوسری دفعہ بنا کر
بھیجا ؟ آج چہرۂ مقصود کو آئینۂ ظہور میں حسبِ
دل دیکھا اور آنکھوں میں اجالا دو چند ہوا ۔

گل چہر : اے برادر بہ جان برابر دولت خاں ! (بلکتی ہے) یہ
کیا معجزہ ! کتنی خوش حالی !

[جہاندار کی دوسری دو بیٹیاں آتی ہیں]

دیکھو بہنو دیکھو ! مدتِ دراز سے پھر اپنا فیروزمند
دولت خاں بھائی ملا ۔

[دولت خاں بہنوں کو بھیٹتا ہے]

مہتاب : ارے یہ کیا دیکھتی ہوں !

[آنکھیں بند کرتی ہے اور گلفام بھی زمین پر پھسل جاتی ہے]

جہاندار : نیک بخت بیٹیو ! اتنی بے قرار کس لیے ہوتی ہو ؟

مہتاب : بزرگ پدر ! ہماری گستاخی اپنے لطف سے معاف کرنا ۔
جو جوانوں نے ہم کو اس ویرانے میں اپنی شمشیر
نگاہ سے گھائل کیا ہے ، وہ نیک بخت یہی ہے جن
کی تلاش میں رات و دن ہم تھے ۔

جہاندار : اے خاوند ! مجھ ضعیف پر آج تیری کتنی نوازش !

ایک ہاتھ پر میری آلکھوں کا گنوایا ہوا گوہر و تخت
کا ٹیکا ، میرا روشن جبین جانشین اچانک بھجوا دیا
اور دوسری طرف سے میری بیٹوں کے درد کی یہ دوا
بھیجی(دونوں جوانوں کو) نیک بخت جوانو ! فرمائیے
آپ کون ہو اور یہاں کہاں سے آ پہنچے ہو ؟

جہانگیر : حضرت جہاں پناہ ! ہماری نراد عالی ہے مگر قسمت
خالی ، ہم بھائی انجانے سے اس ہیرے پر مبتلا ہو کر
ہلاک ہوئے لیکن آپ کی شہزادیاں حسن اور چالاکی
میں کچھ بھی کم تر نہیں ہیں ، اس لیے بہ خوشی
تمام ان نازنینوں کو ہم بھائی قبول رکھتے ہیں اور
(خورشید کو) نامور بانو ! آپ پارسا کے پیچھے بری
نظر کیے ہوئے کی معافی چاہتے ہیں -

[دونوں سر جھکاتے ہے]

ملک : اور میں سوذی اپنا تخت و تاج گنا تیرے پیچھے دیوانہ
بن تجھے ناحق ہلاک کر، میں بھی ہلاک ہوا ، اس لیے
آج بہ جان و دل آزردہ ہوں اور آج اپنے کیے ہوئے
کی پشیمانی کر ، تجھ ماہ رو سے بہت سا عذر چاہتا ہوں -

[سر نماتا ہے]

بابک : (دل میں گھابرا ہو کر) ارے ارے ! اب میں کیا
کروں ؟ (زمین بوس ہوکر) میں آپ نیک زاد کے نفر
سے بھی کمتر بدتر نے اپنی قوت سے سر باہر پھینک ،
جو غیر سلوکی اور بد کام کیا اور آپ سی شاہزادی کو
اپنے ہاتھ سے اذیت دی ، اس سبب سے پریشان اور
آزردہ خاطر ہوں - اور میں گنہگار ہزار بار توبہ کر

معافی الخیر کا امیدوار ہوں ۔

گل چہر : (عجب ہو کر) مگر یہ پری چہر عورت کون ہے؟ اس رمز کا کچھ خلاصہ ہونا چاہیے ۔ برادر جان ، دولت خاں ! تو کچھ اس راز نہاں کا خلاصہ کرسکے گا ؟ وہ میرا خاوند نامدار وزیر کہاں ہے ؟ بلاؤ ان کو ، سب بات عیاں ہو ۔

خورشید : پیاری بہن گل چہر ! معاف کریو مجھے ، وہ وزیر میں ہوں اور تیرا خیالی خاوند بھی میں ہی ۔

گل چہر : ہیں ! ایسا کیونکر ہووے ؟

خورشید : اس میں کچھ عجائبی نہیں ، گردشِ زمان میں ایسا بھی ہو سکتا ہے ۔ اس میرے مہر افروز فیروز کی تلاش میں اور تیرے برادر مہربان دولت خاں کی جدائی میں ، میں نے لباسِ مردانہ اختیار کیا تھا ۔ اس سبھوں میرے پر عاشق ہو کر پھرتے تھے لیکن بہ مہرِ خدا آج میں نے اپنا سچا عاشق کو پائی ۔

[فیروز سے دوبارہ بغل گیر ہوتی ہے]

گل چہر : آہ! ایک طرف سے خوش حالی اور دوسری طرف سے نا امیدی ، یک بیک مجھے تعجبی کے دریا میں ڈبا دیتی ہے ۔ ارے اب میرا کیا ہوگا ؟ میری امید کا شیشہ عجائبی کے سنگ پر پڑ ، چورا ہو گیا ۔ ایک تو بہادر خاں نے بسمل کر ڈالی تھی ، اس پر یہ زیادتی ہوئی ۔

جہاندار : بیٹی ! کاہے کو جی کڑھاتی ہے ، خدا وہ بھی سفل کرے گا ۔

وزیر : نیک بخت! دولت خاں تیرے ساتھ گیا ہوا میرا نورچشم بیٹا ، میرا قائم مقام ، میری ضعیفی کا تھام کہاں ہے ؟ وہ تیرے ساتھ آج کیوں نہیں ، ان کی جدائی سے آج ضعیف ہڈیاں دھوجتی[^] ہیں ۔

فیروز : نیک نام وزیر ! مانند صاحب اور نفر کے ہم دونوں ہرجگہ پر تھے لیکن جب اس نازنین کو میں نے خرید کی تب وہ قدردان دوست نے مجھے بہت سی مدد دی اور سب مال و اسباب فتح شاہ کے دربار میں پہنچانے کو وہ دلی شہر میں رہا تھا، سو پیچھے مجھے ملا نہیں ۔

گل چہر : بے قدر بھائی ! میرا وہ جگرسوز کی ایمانداری کا تو نے ایسا عوض دیا کہ اپنی نازنین لے کے نکل گیا اور اس کو تنہا غمگین چھوڑ کے آیا ، یہ تجھے لائق نہیں تھا ۔

[دل گیر ہو کر بیٹھتی ہے ، اتنے میں ایک نفر داخل ہوتا ہے]

نفر : (جہاندار کو) خدا وند ! ایک مردِ بزرگ اور ایک نوجوان شخص آپ کو ملنے کی شتابی سے آرزو رکھتا ہے ۔

جہاندار : بہ شتاب اس کو لاؤ (نفر جاتا ہے) ۔

خورشید : رونق بخش گل چہر ! غمگین مت ہو ، وہ نیک بخت کی جستجوئی کے لیے اس کے پیچھے ابھی آدمیوں کو روانہ کرتی ہوں ۔ (ملک اور دوسرے عاشق ، جو سر جھکائے بیٹھے ہیں ، ان کو) اے حال تباہ مردو ! میں تم کو معاف بخشتی ہوں لیکن بابک تجھے معاف مشکل ہے ، تیرے سے کئی خلاصوں کی ضرور ہے ۔

بابک : (دل میں) باپ رے ! یہاں سے جیتا چھوڑے گا یا نہیں ، یہ ارابہ[۹] میں تمیں رگڑا جاؤں گا ۔

[بہادر خاں اور ہمایوں داخل ہوتے ہیں]

فیروز : (بہادر کو دیکھتے ہی) شکر الٰہی! ارے یہ کیا خوب بات ! آ پہنچا میرا دوست قدردان بہادر ' (گلے لگتا ہے) بہن گل چہرا اے ایسا پیارا دلدار ، حق تعالیٰ نے اس کو بھی یہاں بھیج دیا ۔

گل چہر : (شتاب اٹھ کر) او عزیز ! او مہربان ! تو نے کتنی انتظاری کھچوائی اور مجھے کتنی نا صبر بنائی ۔

[بلکتی ہے]

وزیر : او میری ضعیفی کی لاٹھی ! شتاب میری ٹھنڈی بغل کو گرمی دے !

[چھاتی سے لگاتا ہے]

جہانگیر : (ہمایوں کی طرف اشارہ کرکے اپنے بھائی جہاں بخش کو) بھائی دیکھ ! اس بزرگ امیر کے چہرۂ مبارک سے کون سی علامتیں پائی جاتی ہیں ، کچھ پہچان میں آتا ہے ؟

جہاں بخش : برادر ! کیا دیکھوں ، میرا مغز بے قرار ہے ، ہو بہو گویا اپنا نیک نام پدر ہمایوں معلوم ہوتا ہے ۔

[دونوں بھائی ہمایوں کے پاؤں تک سر جھکا کر]

جہانگیر : اے مرد بزرگ ! آپ کا کچھ احوال ظاہر کروگے ؟ آپ کون نامدار ہو ؟

ہمایوں : حشمت دار جوان مردو! مجھ سا ایک کم طالع ضعیف کے نزدیک کس لیے سر جھکاتے ہو ؟ اٹھو ' میں اس عزت کے لائق نہیں ہوں ۔

جہانگیر : صاحب ! مہربانی کرکے آپ کا مبارک نام اور مقام فرمانا ؟

ہمایوں : کیسے بیان کروں ؟ کیا کہوں ؟ مغز پھرتا ہے ، زبان خشک ہوتی ہے ۔

بہادر خاں : ارے میں خلاصہ کرتا ہوں ۔ یہ بزرگ آج آفت رسیدہ ہیں ، مگر یہ تو نام بردار ، دنیا دھجانے ہار[۱۰] وہ عزت مند ہمایوں شاہ ہے ۔

جہانگیر : بس بس اے بزرگوار پدر ! اے عزیز سرتاج ! میں آپ کا غلام جہانگیر اور یہ آپ کا بیٹا جہاں بخش ۔

ہمایوں : (چھاتی سے لگا کر) او میری چشموں کی نورانی ! میرے نور چشم بیٹو ! کیا خداوند نے تم کو ملا کر مجھے نئی بادشاہی اور نیا جنم دیا ؟ میں تمھارے لیے راج تاج چھوڑ یہاں آیا ہوں ۔

خورشید : (جا کے بلگ پڑتی ہے) کیا میرا چچا نامدار ہمایوں شاہ ! پدر مجھے پہچانتے ہو ؟ میں آپ کی کم بخت بھتیجی خورشید !

ہمایوں : اے خورشید ! ارے میرا ملاپ ! یہ تو نئی زندگی ۔ بیٹو پہچانتے ہو؟ یہ تمھاری چچیری بہن (بھیٹتے ہیں)۔

جہاندار : ارے آج کیا کھیل خدائی ! ہمایوں شاہ آپ خود ، میرے بزرگوار برادر یہاں تشریف لایا ! خدا کی آج میرے گھرانے کے اوپر کتنی نوازش ! (بھائی کو بھیٹتا ہے) ۔

خورشید : (جہاندار کو نم کر) تب جہاندار شاہ میرا بزرگ چچا! واہ! کیا خوب! میں غیر کی نہیں لیکن بزرگ چچا کی پناہ میں آئی ہوں۔ شکر ہے کہ دیدار مبارک جس طرح کی خواہش تھی ، دیکھا اور قدم بوسی کی آرزو تھی ، بر آئی ۔

جہاندار : (بابک کو دیکھ کر) لیکن سبھوں کی خوشحالی میں اس بے چارے کو کیوں جونکتا" رکھا ہے ۔ اس کا کچھ علاج ، اور یہ دوسر مرد کون ہے ؟ اس کی کچھ پہچان ؟

خورشید : اس دونوں کی پہچان میں کراتی ہوں ۔ (ملک کو) یہ بھی بڑا بادشاہ ہے لیکن حماقت سے مجھ پر دیوانہ ہو کر ناحق ہلاک ہوا ہے ، اور بھی اپنی فضیحتی کروائی ہے ، اس کا نام ملک شاہ ۔

جہاندار : ہاں ملک شاہ ، سندھ کا بادشاہ ، ملک ! ارے یہ کیا بناؤ ؟

خورشید : (بابک کی طرف اشارہ کر[۱۲]) اور یہ تو ایک بڑا چور ہے ۔ مجھے ایک رات کو بہلاوے میں ڈال کے اٹھا لے گیا تھا ، لیکن بہ مہر خدا اس کے ناپاک چنگل سے میں بچ گئی ۔ (بابک کو) بول ! اس بے دولی انگوٹھی تو کہاں سے لایا تھا ؟ یہ بھی کدھر سے ہانہ مار لایا ہے کہ نہیں ؟

گل چہر : عزیز بہن ! یہ بات تجھے پوچھنے سے میں بار بار باز رہی ہوں کہ یہ انگوٹھی تیری انگلی میں کہاں سے آئی؟ اور ایک دوسری عجائب ماہیت[۱۳] تیرے سے چاہتی ہوں ، کہ وہ شکار گاہ میں ایک بن سر کے مردے پر تو

بے ہوش کس لیے گری تھی ؟

خورشید : سچ سچ ، وہ کوئی عجیب بات ہوئی ہے مگر اس سے میں بھی اب تک ناواقف ہوں ۔ فتح‌مند فیروز ! آپ کے لباس میں بن سر کا دھڑ پڑا ہوا میں نے جنگل میں دیکھا تھا ۔ اس کا مرم[۴] کیا ہوگا ؟ میں وہ لاش کو دیکھتے ہی تیرا کالبد سمجھ کے ، بہت سی زاری کر کے ، بے ہوش ہوگئی تھی ۔ وہاں سے تیری بہنیں مجھے یہاں اٹھا لائیں ۔

فیروز : اس رمز کی مجھے کچھ بھی واقفی نہیں ہے ۔ ایسا کہاں سے ہووے "

بہادر خاں : ہا ہا ہا ! میں کہوں ؟ اس کی خبر مجھے ہے ۔ میرے آشنا کے لباس میں پڑا ہوا تو وہ فتح شاہ کا برا کوتوال ظفر خاں تھا جو ناپاک تجھ نازنین کے پیچھے لگ رہا تھا ۔ وہ فیروز کے لباس میں تیرے پیچھے نکلا تھا کہ تجھے راہ میں گرفتار کرے ۔ مگر اس کا خون کس نے کیا ، سو مجھے خبر نہیں ۔

دہاں بخش : اس کا خلاصہ میں کردوں ۔ اس کا سر کاٹنے والا میں ہوں ۔ جب ہم اپنے نام آور والد سے بے دل ہو کر نکل گئے ، تب فتح شاہ کے دربار میں جا کر نوکری رہے تھے ۔ وہاں اس ناپاک کوتوال نے اپنے حسد سے ہمارے پر کوئی فتور چلایا اور ہم کو دیش نکال کروایا ۔ مگر خدا کی مہر سے وہ بدکار کوتوال ایک دن اس جنگل میں آ پہنچا اور ہمارے ساتھ بہت سی سرکشی کرنے لگا ، تو مارے غصے سے میں نے اس کا سر اڑا ڈالا ۔

خورشید : ہا! پاپیوں کو اپنا عوض کیسا ہی یہاں ملتا ہے ۔ اے بابک! اے چور! تو کس لیے اوندھ بیٹھا ہے ۔ ہمارے سوال کا جواب تو دے؟

بابک : نیک ذات بانو! ایک بار معافی دی تو تمام دینا ۔ اس انگشتری میں نے اس شہزادی گل چہر کی انگلی سے ایک دفعہ محل سرا میں آکے گپ چپ نکال لی تھی ۔ اب لاچار ہوں ، جو چاہے سو کرو ۔

خورشید : تجھے کس طرح سے بدلہ دوں ، وہ میرے خیال میں آتا نہیں ۔

گل چہر : ارے اس ناپاک چور کے ہاتھ پاؤں باندھ کے اچھی طرح زیر بند سے مارنا خوب ہے ۔

بابک : (گھابرا ہوکر) ارے صاحبو! میں مر جاؤں گا ، میرے پر بھی ذرا رحم کرو جی ۔

جہاندار : نہیں بیٹی نہیں! سبھوں کی خوش حالی میں اس بچارے کو آزردہ دل رکھنا خوب نہیں ہے ۔ آج حق تعالیٰ نے اپنی رحمت کی بارش ہم پر برسائی ہے، تو ہم پر بھی لازم ہے کہ ہر ایک کو تقصیر کی معافی بخش کر خوش حال کرنا ۔ آج اس آفتِ ناگہانی کے دفع ہونے کے لیے اس صاحبِ غیب دان یزداں کا ثناخواں ہونا واجب ہے ۔ نام دار ملک شاہ! چند روز آپ میرے مہمان ہو کر مجھے سرفرازی دینا ، تمھاری خدمت اس درگاہ میں آپ کی عزت کے موافق ہوگی ۔ بعد روانہ ہو کے اپنے ملک کو نئے سرے سے رونق بخش فرمانا ۔ بابک! آج سے تو بدکاموں کی توبہ کرکے عزت مند ہونا ۔ میں تجھے بھی سروپا دے کر

بھیجوں گا ۔ اور عزت پناہ شاہ ہمایوں ! آپ اپنے سرفراز فرزند کو ہمراہ لے کر یہاں سے رخصت ہونے سے پہلے نکاح کا نیک بیوند سے یہ خوش لقا جوڑے کی شادی میں شامل ہونا ۔ اب میں صاحبانِ مجلس کے حضور ان چاروں جوڑوں کو ملا دیتا ہوں ۔

[خورشید کو فیروز کے ساتھ ، گل چہر کو بہادر خاں کے ساتھ ، جہانگیر اور جہاں بخش کو اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ جوڑ کر]

گانا[۱۰]

فتح مند ، فیروز تو خوشنود رہ
یہ خوبرو خورشید کا ہاتھ لے

اے گل چہر بیٹی ! تو با عز و جاہ
لے بہادر خان کی اب تو پناہ

جہانگیر کو جوڑتا ہوں مہتاب سے
گلفام کو جہاں بخش دیتا ہوں میں

رہو چاروں جوڑو امن سے سدا !
گزارو زندگی چمن میں سدا !

نہ دیکھو جہاں میں کبھی پھر ستم
نہ ہووے تمھارے دل کو کوئی غم

جیو آبرو اور حرمت کے ساتھ
رہو تم عزیزوں میں عزت کے ساتھ

کریم و رحیم کی ستائش کرو
سجدے میں اس کے ، سر اپنا دھرو

/

کہ اس نے دیا دور آفت کا باد
پہنچایا سبھوں کو مقام مراد
خدایا دی جیسی ہماری مراد
اس مجلس کی بھی دیجو ساری مراد

آمین آمین

حواشی

باب پہلا

پردہ پہلا

۱ ۔ اصل : مقام 'شہر دہلی' شروع میں جدا لکھا تھا ۔
۲ ۔ اصل : پالتی مار کے دھنتا بیٹھا ہے ۔
۳ ۔ اصل : مگر خدا دہری ندا کرے گا ۔
۵ ۔ من ۔
۶ ۔ فتح ؟
۷ ۔ ''۔۔۔کہ اسے شکست دے'' محذوف ۔
۸ ۔ اصل : تقدیر کا ۔
۹ ۔ اصل : دیکھیے ہی ۔
۱۰ ۔ اصل : نین تھی ۔
۱۱ ۔ چکچور ۔ گجراتی لفظ ، معنی مغلوب ۔
۱۲ ۔ اصل : من سرودت ۔ معنی دل کو فرحت بخشنے والا ۔
۱۳ ۔ آواز ۔ گجراتی میں مذکر ۔
۱۴ ۔ اصل : اس ۔
۱۵ ۔ اصل : کو ۔
۱۶ ۔ اصل : سونا ۔
۱۷ ۔ برسات ۔ گجراتی میں مذکر ۔
۱۸ ۔ اصل : شیر زمان ۔
۱۹ ۔ بیندھ کر ۔
۲۰ ۔ گجراتی ۔ معنی مقام ، جگہ ۔
۲۱ ۔ گجراتی ۔ خوشحالی ۔
۲۲ ۔ گجراتی ۔ بد حالی ۔

۲۳ - گجراتی - پیداوار -
۲۴ - دونی ، سہمل -
۲۵ - خوسی بد وسمی ن کئی ہے
۲۶ - 'کا' بجائے 'کے' -
۲۷ - گجراتی - لالچ و رسوت -
۲۸ - کدا -
۲۹ - بغیر سوہر کے -
۳۰ - گجراتی میں 'سوب' مذکر -
۳۱ - گجراتی - کستی لڑنا -
۳۲ - گجراتی - حھاپا -
۳۳ - گجراتی - درست -
۳۴ - گجراتی - پائی ہے -
۳۵ - کدا -
۳۶ - اصل : جو ہوں سہ -
۳۷ - ہندی - عصہ -
۳۸ - گجراتی - زہریلا -
۳۹ - پنجابی - طنزیہ جملہ -
۴۰ - گجراتی - لٹیرا -
۴۱ - گجراتی - بے پروا -
۴۲ - گجراتی - اعضائے جسم -

باب پہلا

پردہ دوسرا

۱ - گجراتی - (کی) ضرورت -
۲ - گجراتی - جلوہ -
۳ - گجراتی - شور و غوغا -

۴ ۔ گجراتی ۔ زیب و زینت ۔
۵ ۔ گجراتی ۔ ملی ۔
۶ ۔ گجراتی ۔ غمگیں ۔
۷ ۔ گجراتی ۔ خوشبو ۔
۸ ۔ گجراتی ۔ مناسب جگہ ۔
۹ ۔ گجراتی ۔ لماڑی ۔
۱۰ ۔ اضافۂ مرتب ۔
۱۱ ۔ گجراتی ۔ سلانے کے لیے ۔
۱۲ ۔ ہلد ۔ شہد اور پورے ، غالبا چھتا ۔
۱۳ ۔ گجراتی ۔ لپک کر ۔
۱۴ ۔ اصل : داخل ہو کر (یہ لفظ اس لیے مناسب معلوم نہ ہوا کہ کوتوال اس منظر میں داخل ہو چکا ہے) ۔
۱۵ ۔ اصل : دون (اس لیے غلط کہ 'پانی' سے آگے 'ہوا' کا لفظ موجود ہے) ۔
۱۶ ۔ گجراتی ۔ نقصان ۔
۱۷ ۔ گجراتی ۔ لکیر یا بال ۔

باب پہلا

پردہ تیسرا

۱ ۔ بجائے دریائی ۔
۲ ۔ نرم ۔ کچا (پنجابی) کولا ۔
۳ ۔ سانپ ۔
۴ ۔ صابر ۔
۵ ۔ گجراتی ۔ گہرا ۔
۶ ۔ اضافۂ مرتب ۔
۷ ۔ حلال خور ۔

۸ ۔ کوڑا کرکٹ ، غلاظت ۔
۹ ۔ ملایم ۔
۱۰ ۔ گجراتی ۔ بکواس ۔
۱۱ ۔ گجراتی ۔ خریدے گا ۔
۱۲ ۔ گجراتی ۔ قلابازیاں ۔
۱۳ ۔ گجراتی ۔ دونوں ٹانگیں ۔
۱۴ ۔ پنجابی ۔ اگر ۔
۱۵ ۔ گجراتی ۔ ایک دم ۔
۱۶ ۔ گجراتی ۔ تو ۔
۱۷ ۔ گجراتی ۔ شان و شوکت سے ۔
۱۸ ۔ گجراتی ۔ خراب کرنا ۔ ختم کرنا ۔
۱۹ ۔ پنجابی ۔ ابھی بڑھنے ۔

باب دوسرا

پردہ پہلا

۱ ۔ گجراتی ۔ کردار ۔
۲ ۔ گجراتی ۔ واپس ۔
۳ ۔ گجراتی ۔ بھتا ۔
۴ ۔ گجراتی ۔ خیال ۔
۵ ۔ گجراتی ۔ معلومات ۔
۶ ۔ پنجابی ۔ ابھی ۔
۷ ۔ گجراتی ۔ تو (تمام ڈرامے میں یہی اسلوب ہے) ۔
۸ ۔ گجراتی ۔ جمع نفر بمعنی غلام ۔
۹ ۔ گجراتی ۔ گنگنانا ۔
۱۰ ۔ گجراتی ۔ کسواؤں کا ۔
۱۱ ۔ گجراتی ۔ پڑھ کر ۔

۱۲ - شہر کا نام -
۱۳ - گجراتی - لدی ہوئی اشیا -
۱۴ - کوتوال کی کچہری میں بلا وجہ فیروز کا لباس پڑا ہونا عجیب ہے!
۱۵ - گجراتی - امتیازی نظر آتا ہے -
۱۶ - گجراتی - اگر میں مراد مند ہوں گا -
۱۷ - پنجابی - ٹھنڈا کر کے ، قتل کر کے -
۱۸ - گجراتی - ذہنی اذیت دے دے کر -
۱۹ - گجراتی - ٹھنڈا ہو -
۲۰ - گجراتی - جوڑا -
۲۱ - گجراتی - سرمائے -
۲۲ - گجراتی - مہکتی -

باب دوسرا

پردہ دوسرا

۱ - سر بمعنی سر - نمانے بمعنی جھکنا - یہاں مراد ہے تسلیم کریں -
۲ - برابر کا شریک رہوں گا -
۳ - گجراتی - بنی تھی -
۴ - گجراتی - چپ چاپ - خاموشی سے - چھپا کر -

باب دوسرا

پردہ تیسرا

۱ - کذا -
۲ - گجراتی - سورما ، سردار -

۳ - گجراتی - نهٹر -
۴ - گجراتی - گالی -
۵ - گجراتی - ہارہ -
۶ - گجراتی - برداشت کی جائے -
۷ - گجراتی - بعد میں -
۸ - گجراتی - تاوان لینے والا شخص -
۹ - گجراتی - تماشہ .
۱۲ - سفقت ؟
۱۳ - گجراتی - برباد -
۱۴ - گجراتی - بهنگ -
۱۵ - گجراتی - جهٹ -
۱۶ - گجراتی - مختصر -
۱۷ - اضافۂ مرتب -

باب دوسرا

پردہ چوتھا

۱ - گجراتی - آہ -
۲ - گجراتی - نسان ، پتا -
۳ - گجراتی - نشانی -

باب دوسرا

پردہ پانچواں

۱ - گجراتی - سنگ مرمر -
۲ - ہندی - طاقت -

۳ ۔ مرد ۔ خاوند ۔
۴ ۔ گجراتی ۔ بیل ۔
۵ ۔ گجراتی ۔ غیر ۔
٦ ۔ ہندی ۔ پرائی عورت ۔
۷ ۔ ہندی ۔ فریفتہ ۔
۸ ۔ گجراتی ۔ ناپاک ۔
۹ ۔ ہندی ۔ مشکل ۔
۱۰ ۔ اصل لفظ 'پر ۔ موجودہ صورت حور کا قافیہ بنانے کے لیے ۔

باب تیسرا

پردہ پہلا

۱ ۔ گجراتی ۔ خالص یا محض ۔
۲ ۔ ہندی ۔ لچھن ۔
۳ ۔ گجراتی ۔ مزہ مؤنث ۔
۴ ۔ گجراتی ۔ ترکیب ۔
۵ ۔ گجراتی ۔ کھلتا ۔
٦ ۔ گجراتی ۔ پنکھا جھلتی ہیں ۔
۷ ۔ اصل : تیری گلی ۔ ساقط الوزن ۔
۸ ۔ یہ جملہ غزل سے پہلے تھا ۔ وہاں بے موقع سمجھ کر اسے یہاں منتقل کر دیا ہے ۔
۹ ۔ سانس کی گرمی ۔
۱۰ ۔ کورنش بجا لانا ہے ۔

باب تیسرا

پردہ دوسرا

۱ ۔ گجراتی ۔ سیر نہیں ہونا ۔

۲ - گجراتی - جیسے -
۳ - گجراتی - نقش کی -
۴ - گجراتی - خبر دار رہنا -
۵ - گجراتی - چچا -
۶ - گجراتی - ڈھونگ کرنے والے -
۷ - پنجابی - اگر -
۸ - کذا -
۹ - گجراتی - بھٹک گئے ہیں - پاگل ہو گئے ہیں -
۱۰ - گجراتی - اجالا -
۱۱ - گجراتی - نہ ٹلنے والی -
۱۲ - گجراتی - ڈسے -

باب تیسرا

پردہ تیسرا

۱ - اسٹیج کے نصف حصے میں کھڑکی والا دو منزلہ محل جو تماسائیوں کے رخ کھلا ہوا ہے - نیچے باقی نصف حصے میں دریا -
۲ - گجراتی - چھپا -
۳ - لخلخہ : کپکپی ، لرزہ -
۴ - اصل : میں بھلنی تجھ کو اے میری جان -
۵ - گجراتی - مصائب کا -
۶ - وقفہ -
۷ - گجراتی - کڑھنا -
۸ - گجراتی - فقیر -
۹ - غور سے ، ٹکٹکی باندھ کر -
۱۰ - گجراتی - خوشی سے -
۱۱ - گجراتی - دھڑکتی -

۱۲ ۔ گجراتی ۔ طریقہ ۔
۱۳ ۔ گجراتی ۔ ساجھنا ۔ راست ہونا ۔
۱۴ ۔ گجراتی ۔ کرشمہ ، معجزہ ۔
۱۵ ۔ گجراتی ۔ دل ۔
۱۶ ۔ گجراتی ۔ ترکیب ۔

باب تیسرا

پردہ چوتھا

۱ ۔ گجراتی ۔ پھاگ کھیلنے کی تقریب ۔ مراد ہنسی مذاق ۔
۲ ۔ گجراتی ۔ مکر ، فریب ۔
۳ ۔ گجراتی ۔ رذیل ۔
۴ ۔ گجراتی ۔ خبر ۔ آگاہی ۔
۵ ۔ گجراتی ۔ حصہ ۔
۶ ۔ گجراتی ۔ ایک ایک ۔
۷ ۔ گجراتی ۔ بھید ۔ راز ۔
۸ ۔ گجراتی ۔ قتل کرکے ۔
۹ ۔ گجراتی ۔ چکر آ رہے ہیں ۔

باب تیسرا

پردہ پانچواں

۱ ۔ گجراتی ۔ بے تابی ۔
۲ ۔ گجراتی ۔ بھگا ۔
۳ ۔ گجراتی ۔ موقع ۔
۴ ۔ گجراتی ۔ انحصار ۔

۵ - گجراتی - خبردار کرنا - ہوشیار کرنا -
٦ - گجراتی - جانچ کر -
۷ - گجراتی - مصیبت -
۸ - گجراتی - لپکا

باب تیسرا

پردہ چھٹا

۱ - گجراتی - سہارا -
۲ - گجراتی - سرمہ -
۳ - گجراتی - ہٹا کر -
۴ - گجراتی - خویش و اقارب -

باب چوتھا

پردہ پہلا

۱ - گجراتی - حلیہ ، شکل و شباہت -
۲ - گجراتی - باوجود -
۳ - گجراتی - فریبی - مفسد -
۴ - گجراتی - کپکپی ، لرزہ -
۵ - اصل : محب -
٦ - اضافۂ مرتب -
۷ - غالباً بجائے ''ہی''۔
۸ - خون بہ معنی قتل -
۹ - گجراتی - تاریکی -
۱۰ - گجراتی - ضرورت -

۱۲ - گجراتی - کنواری -
۱۳ - ُبج : بہ معنی بیسکش -
۱۴ - گجراتی - بہت تیز -
۱۵ - گجراتی - منتشر کرنا -

باب چوتھا

پردہ دوسرا

۱ - غزل کے تمام اشعار ، کذا -
۲ - گجراتی - شگوفہ چھوڑا ، تماشہ کیا -
۳ - گجراتی - کونا کھدرا (قیاسی)
۴ - گجراتی - نزدیک -
۵ - گجراتی - گھونسا ، تھپڑ -

باب چوتھا

پردہ تیسرا

۱ - گجراتی - ابھارتی ، اکساتی -
۲ - گجراتی - کراہت -
۳ - گجراتی - متلی ہوتی ہے -
۴ - گجراتی - زبردست -

باب چوتھا

پردہ چوتھا

۱ - چوگان : میدان -

۲ - گجراتی - غرق کرنے والی -
۳ - ننکھ : پر -
۴ - گجراتی - مذکر - مایہ -
۵ - گجراتی - بیٹھ -
۶ - پنجابی - وقت ، گھڑی -
۷ - گڑھے -
۸ - کھڈا -

باب چوتھا

پردہ پانچواں

۱ - گجراتی - اندھیرے -
۲ گجراتی - چھپی -
۳ - گجراتی - بے اولاد -
۴ - گجراتی - پکڑ -

باب پانچواں

پردہ پہلا

۱ - اضافہ مرتب -
۲ - گجراتی - بہت -
۳ - تقرر -

باب پانچواں

پردہ دوسرا

۱ - گجراتی - چونکا -

۲ ۔ گجراتی ۔ آوارہ (قیاسی) ۔

۳ ۔ دھنیا ؛ (پنجابی) پینجا ۔

۴ ۔ گجراتی ۔ شور و غوغا ۔

۵ ۔ گجراتی ۔ آڑ ۔

۶ ۔ اضافۂ مرتب ۔

باب پانچواں

پردہ تیسرا

۱ ۔ گجراتی ۔ ڈرنے والا ۔

۲ ۔ گجراتی ۔ واقعہ ۔

۳ ۔ گجراتی ۔ اتفاق ۔

۴ ۔ گجراتی ۔ بھرنی ۔

باب پانچواں

پردہ چوتھا

۱ ۔ اضافۂ مرتب ۔

۲ ۔ گجراتی ۔ تھکن ۔

۳ ۔ بہادر خاں ۔

۴ ۔ گجراتی ۔ مایوس ہوگیا ہوں ۔

۵ ۔ اضافۂ مرتب ۔

باب پانچواں

پردہ پانچواں

۲ - گجراتی - تھوڑا -
۳ - پنجابی - لیجئے -
۴ - چلا کر -
۵ - لٹتی ہے -
٦ - گجراتی - بغل گیر ہوتا ہے -
۷ - گجراتی - سر جھکاتا ہے -
۸ - گجراتی - لرزتی -
۹ - اراپہ : شبہ -
۱۰ - گجراتی - دنیا کو لرزانے والا -
۱۱ - گجراتی - پریشان -
۱۲ - اضافۂ مرتب -
۱۳ - اطلاع : معلومات -
۱۴ - بھید -
۱۵ - اضافۂ مرتب -

ضمیمہ جات

ضمیمہ اول

بمبئی کی تاریخ پر ایک سرسری نظر[1]

سولہویں صدی کے نصف اول میں بمبئی نام تھا مغربی ہندوستان کے ساحل کے قریب ایک گمنام ، الگ تھلگ اور بے حیثیت سے جزیرے کا ، جس کی آبادی شاید دو چار ہزار نفوس سے زیادہ نہ ہوگی ۔ ظہیرالدین بابر کے انتقال سے غالباً برس بھر پیشتر یعنی ۱۵۲۹ء میں اس جزیرے پر پرتگیزوں کا قبضہ ہو گیا ۔ اس سے بیشتر بمبئی کی تاریخ میں اس کے سوا اور کوئی قابل ذکر معلوم نہیں ہوتی کہ دیو گری کے راجہ بھیم نے یہاں ایک قصبہ آباد کیا تھا جو ۱۳۴۸ء تک ہندوؤں کے قبضے میں رہا ۔ اس کے بعد گجرات کے مسلمان بادشاہوں کی سلطنت کا حصہ بن گیا ۔ جب پرتگیز آئے تو یہاں تنا (Tanna) کے بادشاہ کی حکومت تھی جو گجرات کے سلطان بہادر کا ماتحت تھا ۔

پرتگیزوں نے ادھر کا رخ کیوں کیا تھا ، اس کی مختصر داستان یہ ہے کہ پندرہویں اور سولہویں صدی میں یورپ پر ترکوں کا اقتدار اس قدر بڑھ گیا تھا کہ مغرب و مشرق کی تجارت جن راستوں سے ہوتی تھی ، وہ سب مغربی طاقتوں کے لیے بے حد مخدوش ہو گئے تھے ۔ بحیرہ روم جو زمانہ وسطیٰ کی تجارت کا مرکز تھا ، مراکش کے بحری قزاقوں سے پٹا پڑا تھا ،

ادھر صلیبی جنگوں کے بعد یورپ کو مشرق کی مصنوعات کے ساتھ گرم مصالحوں کا چسکا پڑچکا تھا ۔ یہ مصالحے گوشت کو محفوظ کرنے اور شراب کو لذیذ تر بنانے میں کام آتے تھے۔ ان حالات میں یوروپین تاجروں نے کوشش شروع کی کہ ہندوستان اور گرم مصالحوں کے جزیروں تک پہنچنے کے لیے کوئی زیادہ مضبوط نیا راستہ تلاش کیا جائے۔ پہل پرتگیزوں نے کی ، سمندری سیاحوں کی چند ابتدائی کوششوں کے بعد واسکوڈے گاما نے راس امید کے راستے ۱۸ - مئی ۱۴۹۸ع کو کالی کٹ پہنچ کر یوروپین اقوام کے لیے مشرقی سمندروں کا ، ہندوستان کا اور گرم مصالحے کے جزیروں کا راستہ کھول دیا ۔

پرتگیزوں نے اس علاقے میں طاقت حاصل کی تو پہلے بحیرہ عرب اور بحر ہند میں عربوں کی سمندری تجارت برباد کی، پھر بمبئی کے جنوب میں ساحل مالا بار پر کالی کٹ (Calicut) کنانور (Cananore) دابل (Dabul) اور چول (Chaul) میں نو آبادیاں قایم کر لیں ۔ رفتہ رفتہ اپنی طاقت اتنی بڑھائی کہ ۱۵۱۰ع میں البوکرک نے گوا لے لیا جو اس زمانے میں مغربی ہند کی بہترین بندرگاہ تھا اور جنوبی جزیرہ نمائے ہند کے چوٹی کے شہروں میں شمار ہوتا تھا ۔ گوا پرتگیزی ہند کا دارالحکومت قرار پایا ۔ ۱۵۳۳ع میں بسین لے لیا گیا ، ۱۵۳۴ع میں یہ شہر مع اپنے تعلقوں کے جن میں سالسٹ (Salsette) اور بمبئی شامل تھے ، گجرات کے سلطان بہادر نے باضابطہ طور سے خود پرتگیزوں کے حوالے کردیا ۔ گوا اور خلیج فارس کے سرے کے شہر آرمس (Ormus) کے درمیان کوئی اور مقام پرتگیزوں کے قبضے میں نہ تھا چنانچہ انھوں نے بار بار حملہ کر کے آخر ۱۵۴۶ع میں دیو (Diu) پر بھی قبضہ جما لیا ۔ سولھویں صدی

کے نصف آخر میں جب ہند کے مغربی ساحل پر پرتگیزوں کے قدم خوب مضبوطی سے جم چکے تھے، بمبئی کو بسین (Bassein) کے کیپٹن جنرل کے ماتحت ایک ضلع قرار دے دیا گیا۔ ادھر یورپ میں ۱۵۸۰ء میں پرتگال ہسپانیہ کے ماتحت ایک صوبہ قرار پا گیا۔ لیکن اپنے مشرقی مقبوضات کا انتظام وہ پھر بھی تقریباً آزادانہ کرتا رہا۔

سولھویں صدی کے آخر میں انگریز ہندوستانی تجارت کے امیدوار بن کر اس جانب پہلے پہل وارد ہوئے۔ بمبئی کے محل وقوع کو دیکھا تو بے اختیار اس پر قبضہ جمانے کو جی للچایا، وہاں قدم جمانے کی جو دو ایک کوششیں کیں وہ بارآور نہ ہو سکیں مگر قسمت کی خوبی کہ ۱۶۶۱ء میں انگلستان کے بادشاہ چارلس دوم کی شادی پرتگال کی شہزادی کیتھرین سے ہوئی۔ وہ انگلستان آئی تو جہیز میں بمبئی مع سالسٹ اور تنا کے تعلقوں کے ساتھ لائی۔ شاہ انگلستان نے ایک پرتگیز کمشنر کے ہمراہ شاہی بیڑے میں لارڈ مارل‌برو (Lord Morlborough) کی زیر قیادت سر ابراہام شپ مین (Sir Ibraham Shipman) اور پانچ سو تربیت یافتہ سپاہی روانہ کیے کہ جہیز کا علاقہ پرتگیزوں سے لے کر اپنی سلطنت میں شامل کر لیں۔ ہندی پرتگیزوں کو گوارا نہ ہوا کہ بمبئی اور اس کے ساتھ دوسرے تعلقے چپ چپاتے ہاتھ سے نکل جائیں چنانچہ وہ ساحل ہند پر انگریزی فوجوں کے قدم دھرنے کے کسی طرح روادار نہ ہوئے۔ ان حالات میں انگریزی فوجوں کے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ انگے دیوا (Angediva) کے جزیرے میں جا اتریں۔ حالات کی ناسازگاری کے باعث سر ابراہام اور کئی سپاہی وہاں مر گئے۔ مجبوراً سر ابراہام کے سیکرٹری نے ہندی پرتگیزوں سے اس بات کا

معاہدہ کرلیا کہ ہم تمھارے باقی سب علاقوں سے دست بردار ہوتے ہیں ، ہمیں صرف بمبئی کا جزیرہ دے دیا جائے ۔

چارلس دوم کو اس معاہدے کا علم ہوا تو یک قلم اسے موقوف کر دیا اور پورے علاقے کے علاوہ شاہ پرتگال سے لارڈ مارل برو کی مہم کے جانی و مالی نقصان کے تاوان میں ایک لاکھ پونڈ کا مطالبہ بھی کر دیا ۔ کچھ واضح نہیں ہوتا کہ خسر سے داماد کے اس مطالبے کا نتیجہ بالآخر کیا نکلا ، بس اتنا معلوم ہے کہ انگریز ۱۶۶۴ء تک بمبئی کی سر زمین پر قدم نہ دھر سکے لیکن بمبئی جب مل گیا تو شاہ انگلستان کو چنداں منفعت بخش معلوم نہ ہوا چنانچہ ۱۶۶۸ء میں بعوض دس پونڈ زر سرخ کے سالانہ کرائے پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کر دیا ۔ اس وقت بمبئی کی آبادی صرف دس ہزار تھی ۔

بمبئی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ آیا تو اس نے یہاں کی آبادی بڑھانے اور شہر کو ہر اعتبار سے ترقی دینے میں اپنے بس کی کوئی کوشش نہ اٹھا رکھی لیکن اس زمانے میں جزیرے کا بیشتر حصہ چٹانوں ، دلدلوں اور جنگلوں سے پٹا پڑا تھا ۔ زمین کی پیداوار نہ ہونے کے برابر تھی ۔ مویشی خال خال نظر آتے تھے ، حشرات الارض کی بھرمار تھی ، آب و ہوا اتنی خراب کہ بیماریاں اور وبائیں عام تھیں ۔ ان حالات میں ایسٹ انڈیا کی ترغیبوں سے آبادی میں اضافہ تو ہوا لیکن بہت کم ۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ بمبئی کو بیرونی خطرے گھیرے ہوئے تھے ۔

سولھویں ہی صدی میں دکن کی بہمنی حکومت ختم ہونے کے بعد اس کی وسیع مملکت پانچ مسلم حکومتوں میں تقسیم ہو گئی تھی ۔ یہ تھیں بیجا پور ، احمد نگر ، گولکنڈہ ، بیدر

اور برار کی حکومتیں ۔ ان حکومتوں کے فرماں رواؤں نے ۱۵۶۵ع میں بیجاپور کے رام راجہ کو ایک جنگ عظیم میں شکست دے کر ہندوستان کی آخری ہندو سلطنت کو نیست و نابود کر ڈالا تھا ۔ ادھر سترھویں صدی کے نصف اول میں مغل قلمرو جنوب کی طرف برابر پھیلتی اور ترقی کرتی جا رہی تھی یہاں تک کہ شاہ جہاں کے عہد میں (۱۶۵۸ع - ۱۶۲۷ع) اس نے بے مثال عظمت و شوکت حاصل کر لی ۔ البتہ گولکنڈہ اور بیجاپور کے سلطان مغلوں سے مغلوب نہ ہو سکے تھے اور اس وقت بھی آزاد تھے جب انگریز بمبئی میں وارد ہونے تھے ۔ شاہ جہاں اور اس کے بعد عالمگیر نے ان دونوں سلطنتوں کو تخت دہلی کا اطاعت گزار بنانے میں اتنی جد و جہد کی کہ اپنے آپ کو تباہ کر لیا ۔

ایک مرہٹہ سردار سیواجی بھونسلے (سن پیدائش مئی ۔ ۱۶۲۷ع) جو سلطان بیجاپور کے نمک خواروں میں تھا ۔ دو مسلمان حکمرانوں کو خود کشی کی اس مسلسل جنگ میں الجھا دیکھ کر منصوبے بنانے لگا کہ دیش کو دونوں کے چنگل سے نکال کر آزاد کیا جائے ۔ اس نے پہاڑوں اور وادیوں کے کاشتکاروں کے جتھے بنا بنا کر ان کی مدد سے بعض کوہستانی قلعوں پر قبضہ کر لیا اور بیجاپور کے جرنیل افضل خاں کو اپنا مہمان بلا کر بغل گیر ہوتے ہوئے بچھوا گھونپ کر ہلاک کر ڈالا ۔

سیواجی نے مغل شہنشاہ اور سلطان بیجاپور کے علاقوں کو (۲) حزم و احتیاط سے کام لے کر یوں غصب کرنا شروع کیا کہ دونوں طاقتوں میں سے کسی سے علانیہ قطع تعلق نہ ہونے پائے ۔ ایک طرف دیدہ دلیری سے ان کے علاقوں میں غارتگری مچاتا ۔ دوسری طرف نہایت نادمانہ معافی کا خواستگار

ہو جاتا ۔ اس طرح اس نے اپنے مقبوضات کی حدود کو توسیع دے لی ۔ زر و جواہر کثیر مقدار میں فراہم کیا اور لوگوں کو عادی بنا دیا تھا۔ ایسی تمام کارروائیوں میں وہ اسے اپنا رہنما سمجھیں جو مسلم حکمرانوں کو لوٹنے اور تباہ کرنے کے کارگر اور سریع الاثر قومی طریق کار کے مطابق عمل میں لائی جاتی تھیں ۔ کچھ عرصے بعد سیواجی نے آزادی کا علانیہ دعوے دار بن کر قومی تنظیم کی اور اپنے مقبوضہ علاقے کا نظم و نسق باقاعدہ سنبھال لیا ۔ اس کی فوجی قوت فقط اس کے سوار سپاہی تھے ، پستہ قد لوگ جن کے گھوڑے سبک رفتار تھے ، غذا مٹھی بھر چنے ؛ سپاہ آرائی کا یہ ڈھب کہ جم کر جنگ کرنے سے گریز کرتا ۔ مسلمانوں کی اسلحہ سے مغرق افواج کے مقابلے میں پلہ اپنی اعلیٰ قوت اور بہتر تنظیم کی بدولت اسی طور بھاری رہ سکتا تھا چنانچہ یہ طریق اختیار کر رکھا تھا کہ بہت مستعدی اور پھرتی سے کبھی یہاں اور کبھی وہاں اچانک جا پڑتا اور بھاری بھرکم مغلیہ افواج کے پہنچنے اور کوئی کوشش عمل میں لانے سے پہلے خوش حال شہروں اور قلعوں میں کھلے بندوں غارت گری مچاتا ۔ عوام کی ہمدردیاں اس لیے حاصل تھیں کہ گایوں ، کاشتکاروں اور عورتوں کی محافظت کرتا اور صرف متمول تاجروں کو لوٹتا ۔ جنوبی مرہٹہ علاقے کے خاص ضلعوں اور جنوبی کونکن پر قابض ہونے کے بعد سیواجی(۳) نے مغلوں کے شمالی اضلاع پر بھی فوج کشی کر دی اور بڑھتا بڑھتا سورت تک جا پہنچا ۔ جہاں خوب غارت گری مچائی ۔ (۵ ۔ جنوری ۱۹۶۴ع) یہاں سے اپنے صدر مقام رائیگور پہنچ کر راجہ کا لقب اختیار کیا اور اپنے نام کا سکہ رائج کر دیا ۔ تقدیر نے نشیب و فراز دکھائے لیکن اپنی عیاری اور دلیری سے بالآخر ساحل کے

کئی مقامات سمیت تمام مغربی ہند پر قبضہ کر لیا اور اپنی سلطنت کی حدود دریائے نربدا سے دریائے کرشنا تک پھیلا لیں۔ ۶ - جون ۱۶۷۴ء کو رائیگور میں تخت نشینی کی رسم باقاعدہ ادا ہوئی - ۱۶۷۵ء میں مرہٹوں نے دریائے نربدا کو جہاں ان کے قومی علاقے کی حدود ختم ہو جاتی تھیں، پہلی بار عبور کیا۔

سترھویں صدی کے وسط کے یہ مختصر حالات اتنی بات واضح کرنے کو کافی ہیں کہ اس زمانے میں بمبئی کے انگریزوں کی مد مقابل تین بڑی طاقتیں تھیں۔ ایک تو مغل شہنشاہی جس کے اقتدار کو اگرچہ گھن لگ چکا تھا لیکن ساکھ اور ظاہری شوکت کا ڈھونگ ابھی تک باقی تھا۔ دوسرے مرہٹے جنھیں ایک ایسا رہنما میسر آ گیا تھا جو عیاری اور بیباکی میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا اور تیسرے پرتگیز جو بتدریج ترقی کرتے کرتے شہرت کے عروج پر پہنچ چکے تھے۔ سورت کے انگریزوں نے مغل شہنشاہی کے مغربی صوبوں کے مسلم صوبے دار سے مناسب تعلقات پہلے ہی استوار کر رکھے تھے۔ سیواجی نے سورت پر حملہ کیا تو انگریزوں نے اپنے کارخانوں کی حفاظت کامیابی سے کر کے باہمی تعلقات اور سدھار لیے۔ لیکن رفتہ رفتہ جب مرہٹہ حکومت نے زیادہ طاقت پکڑی اور دکن اور گجرات کی اعلیٰ ہند کی مرکزی ریاستوں سے تجارت تمام تر ان کے رحم و کرم پر منحصر ہو گئی تو انگریزوں کو مرہٹوں سے صلح صفائی کر لینا قرین مصلحت معلوم ہوا لیکن سیواجی نے بلکہ اس کے بعد کے چند جانشینوں نے بھی بمبئی سے کچھ تعرض نہ کیا۔ البتہ انگریا اور بعض دوسرے مرہٹے سمندری قزاق وقتاً فوقتاً ان کے نام پر انگریزی علاقے میں غارتگری ضرور مچاتے رہے۔ جہاں تک مرہٹوں کا تعلق ہے انھوں نے اسی زمانے میں

بمقابلہ ان سمندری قزاقوں کے ایک زیادہ خطرناک دشمن یعنی پرتگیزوں کے مقابلے میں انگریزوں کو امداد پہنچائی۔ پرتگیز سالسٹ اور کرنجا کے جزیروں پر قابض تھے اور اپنے کرنجا اور تنا اور بندورا کے قلعوں پر قابض ہونے کے باعث کوشاں تھے کہ نہ بمبئی میں رسد پہنچے اور نہ بمبئی اپنی تجارت کو جاری رکھ سکے۔ جزیرہ بمبئی کے بالمقابل ہند کا ساحلی علاقہ مرہٹوں کے قبضے میں تھا۔ اس موقع پر انھوں نے انگریزوں کو رسد باقاعدگی سے مہیا کرکے فاقوں کی مصائب سے بچا لیا۔ اس کے معاوضے میں وہ انگریزوں سے اسلحہ جنگ اور دوسری غیرملکی اشیاء حاصل کرتے رہے۔

پرتگیزوں کی شرانگیزی سے تنگ آ کر ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۶۷۵ع میں اپنے بادشاہ چارلس دوم سے فریاد کی کہ ہم بمبئی کے جزیرے کے استحکامات پر ستر ہزار پونڈ صرف کرچکے ہیں لیکن پرتگیز عہد نامے کی شرائط کو نظر انداز کرکے، ہمارے جہازوں اور ہمارے تجارتی مال پر زبردستی ہم سے ٹیکس وصول کرتے ہیں۔ لہذا حکومت کو لازم ہے کہ ہماری داد رسی کے لیے مناسب جوابی کارروائی عمل میں لائے۔ اس پر بادشاہ نے کمپنی کو ہدایت بھیجی کہ پرتگیزوں کو ٹیکس دینا بند کر دیا جائے۔ انگریزوں اور پرتگیزوں کا یہ جھگڑا اسی طور چلتا رہا۔ یہاں تک کہ انگریزوں کے خلاف پرتگیزوں نے مغلیہ شہنشاہ کے امیرالبحر سیدی سے جو جنجیرے کے حبشی کے لقب سے مشہور تھا اتحاد کر لیا۔ جنجیرے کی چھوٹی سی ریاست ساحل پر چند میل جنوب میں واقع اور شیدی کا صدر مقام تھی۔ مرہٹوں سے آئے دن اس کی جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ جب مرہٹوں نے کنیری کا چھوٹا سا جزیرہ جس پر بعد

میں بمبئی کی بندرگاہ کے سامنے روشنی کا مینار بنایا گیا ، نے ایا اور قلعہ بندیوں سے مستحکم کر لیا تو کنیری کے آس پاس کے چھوٹے چھوٹے جزیروں پر شیدی قابض ہوگیا اور انھیں مستحکم کر لیا ۔ انگریزوں نے اس جھگڑے میں کسی کا بھی ساتھ نہ دیا لیکن ان کی ایک بات نے شیدی کو برافروختہ کر دیا ۔ شیدی مرہٹی علاقے پر حملہ آور ہو کر وہاں کے جن باشندوں کو گرفتار کرتا ، انھیں مازگاؤں اور بمبئی لا کر بطور غلام کے فروخت کرنا چاہتا ۔ انگریزوں کو اندیشہ تھا کہ شیدی کی اس حرکت کے باعث مرہٹے ان سے بگڑ کر ان پر حملہ آور نہ ہوجائیں چنانچہ انھوں نے شیدی کو اس کی ممانعت کر دی ۔ انگریزوں کی یہ ممانعت شیدی کو ناگوار گزری چنانچہ اس نے ۱۶۸۹ء میں بمبئی فورٹ کا محاصرہ کرلیا ۔ انگریزوں میں اتنی سکت نہ تھی کہ شیدی کو جزیرے سے نکال سکتے چنانچہ مقابلہ کرنے کی بجائے انھوں نے پوری کوشش کرکے مغل شہنشاہ کو یہ احکام صادر کرنے پر آمادہ کیا کہ شیدی اپنی فوجیں جزیرے سے ہٹا لے نیز شیدی نے محاصرہ چونکہ پرتگیزوں کے ایما و امداد سے کیا تھا ، اس لیے باہم تریل اور جزیرے کے دوسرے پرتگیری مقامات تاوان کےطور پر انگریزوں کو دلائے جائیں ۔ اس سے پرتگیز انگریزوں کے خلاف اور زیادہ تلخ ہوگئے ۔ لیکن انگریزوں کی طاقت پھر بھی بتدریج بڑھتی چلی گئی ۔ ۱۷۰۰ء میں بمبئی کے انگریز گورنر مسٹر بون نے پرتگیزوں سے محاصل اور تجارت کی بعض شاہراہیں کھولنے کا مطالبہ کیا ۔ انگریزوں نے ۱۷۲۱ء میں انتقاماً مرہٹے بحری قزاق انگریا سے اتحاد کر لیا ۔ اسے اپنے مقبوضات میں جگہ دے کر امداد پہنچائی اور باہم میں انگریزوں کو محاصل ادا کرنا موقوف کر دیا ۔

انگریز مصر رہے کہ دریائے ماہم اور ماہم کا قلعہ اور اس کے آس پاس کا کل علاقہ ہمارا ہے ۔ پرتگیزوں نے چڑھ کر ۱۷۲۲ع میں ماہم کے قلعے اور انگریزوں کے بعض جہازوں پر حملہ کر دیا ۔ کرلا کے مقام پر مورچے باندھ لیے جو انگریزوں نے برباد کر ڈالے ۔ ان چپقلشوں کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ انگریزی حکومت نے دخل انداز ہو کر گوا کے پرتگیزی وائسرائے کو ہدایت بھجوائی کہ وہ بسین کے پرتگیزی کپتان جنرل کو جو انگریزوں کا شدید دشمن تھا ، برطرف کر دے ۔ اس کی علیحدگی کے بعد انگریزوں کے خلاف پرتگیزوں کی جانب سے پھر کوئی حرکت عمل میں نہ آئی ۔ ایک طرف مرہٹے ، مغل اور پرتگیز ایک دوسرے کو برباد کرنے میں برابر مصروف رہے ، دوسری طرف انگریز بمبئی کی قدر و قیمت اور اس کے امکانات کو بخوبی سمجھتے ہوئے اپنے اس چھوٹے سے جزیرے سے برابر وابستہ رہے ۔ سورت میں انگریزوں کی نوآبادی تمام تر مغل صوبے دار کے رحم و کرم پر منحصر تھی ، اس نے کئی بار انھیں لوٹا اور کمپنی کے افسروں کو حراست میں لے لیا ۔ یہ بات بمبئی میں نہ تھی وہاں انگریز خود مختار اور سیاہ و سفید کے مالک تھے ۔ چنانچہ ۱۶۸۶ع ہی میں کمپنی کے احکام آ چکے تھے کہ ہند کے مغربی ساحل کے برطانوی مقبوضات کا دارالحکومت سورت کی بجائے بمبئی ہوگا ۔

اٹھارہویں صدی کے وسط میں سیاسی و فوجی اعتبار سے بمبئی کو اہمیت حاصل ہونا شروع ہوئی ۔ ۱۷۵۶ع میں یعنی پلاسی کی جنگ سے ایک سال قبل اڈمرل واٹس اور کرنل کلائیو نے کولابہ کے مرہٹہ سردار انگریا پر حملہ کر دیا ۔ انگریا کے متعلق بتایا جا چکا ہے کہ وہ مرہٹہ اور بحری قزاق

تھا جس نے سترھویں صدی کے اواخر ہی سے طاقت پکڑ کر تمام اقوام کے جہازوں کو لوٹنا اور تراوں کور سے بمبئی تک ساحل کے شہروں اور بعض غیر محفوظ تجارتی مقامات میں بار بار اتر کر غارتگری مچانا شروع کر دیا تھا ۔ مغل شہنشاہی کمزور پڑی تو اس نے مغل امیرالبحر شیدی کا ناطقہ بھی بند کر دیا ۔ شیدی کے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ حنجیرے کے قلعے میں پناہ گزیں ہو جائے ۔ انگریا اس کے قلعے کا محاصرہ ہر سال کرتا لیکن اسے تسخیر کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکا ۔ کونکان کے اضلاع پر تقریباً انگوریا تک اسی کا قبضہ تھا ۔ سورن درگ اور وزیا درگ یعنی گھیریا میں اس کے مضبوط قلعے تھے ۔ کولابہ کا جزیرہ اس کا خاص اڈہ تھا ۔ بمبئی کے انگریزوں سے اس نے ایک عرصے تک تعرض نہ کیا لیکن ایک جہاز جس پر انگریزی جھنڈا لہرا رہا تھا ، اپنے قبضے میں کر لیا تھا ۔ اس پر ۱۷۱۷ع میں اس کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا گیا ۔ کچھ عرصے بعد انگریزوں نے پرتگیزوں سے مل کر اس کے خلاف جارحانہ کارروائیاں شروع کیں لیکن نتیجہ ان کا کچھ نہ نکلا ۔ ایک متحدہ مہم بھیجی گئی مگر وہ بھی ناکام رہی ۔ آخر انگریزوں کو انگریا کے خلاف بالاجی سے اتحاد کرنا پڑا ۔ بالاجی کے سلسلے میں مرہٹہ حکمرانوں کے بہت مختصر حالات بیان کرنا نامناسب نہ ہوگا ۔

مرہٹہ حکمرانی کی صورت یہ تھی کہ ۱۶۸۰ع میں سیواجی کے مارے جانے کے بعد اس کا بیٹا سنبھاجی راجہ بنا ۔ جو ۱۶۸۳ع میں اورنگ زیب سے شکست کھا کر مارا گیا ۔ اس کے بعد راجہ رام راجہ بنا ، ۱۷۰۰ع میں اس نے وفات پائی تو عنان حکومت اس کی بیوی تارابائی کے ہاتھ آئی ۔ تارابائی نے

اپنے بیٹے سیواجی ثانی کے نام پر حکومت شروع کی ، ۱۷۰۷ع میں اورنگ زیب کی وفات ہوئی اور جنوری ۱۷۰۸ع میں سیواجی کا پوتا ساہو تخت پر بیٹھا ۔ تارابائی سے چار سال تک اس کی جنگ ہوتی رہی ۔ آخر تارابائی اور سیواجی ثانی گرفتار ہوئے ۔ راجہ رام کے دوسرے بیٹے شنبھاجی اور شاہو کا معاہدہ ہو گیا اور سلطنت دو حصوں میں تقسیم کرلی گئی ۔ شاہوجی کے عہد حکومت میں اس کے وزیر نے جو پیشوا کہلاتا تھا اپنا اقتدار بڑھا لیا ۔ وزارت کا عہدہ موروثی تھا ۔ اگلا پیشوا باجی راؤ بنا ۔ اس نے راجہ سے نظامت کے جملہ اختیارات خود حاصل کر لیے اور اسے برائے نام راجہ بنا کر ستارہ میں قلعہ نشین کر دیا ۔

اس بالا جی سے بمبئی کے انگریز گورنر نے ۱۷۵۵ع میں گہرے تعلقات قائم کر لیے تھے ، ادھر انگریا نے پیشوا کی اطاعت سے انکار کر دیا تھا چنانچہ انگریز اور پیشوا دونوں اس کے خلاف ہو گئے - ۲۲ مارچ ۱۷۵۶ع کو بمبئی کی بحری فوج کے کموڈور جیمز نے پیشوا کے بحری بیڑے کے ساتھ حملے کا منصوبہ بنا کر سورن درگ کا رخ کیا جہاں انگریا کے جہاز موجود تھے لیکن قرارداد کے مطابق مرہٹہ بیڑا بروقت نہ پہنچ سکا ۔ شبہ کیا گیا کہ مرہٹوں کی سمندری فوج کی ہمدردیاں اندر اندر انگریا کے ساتھ ہیں چنانچہ اس نے حملہ کے منصوبے سے انگریا کو پہلے سے مطلع کر دیا تھا اور دانستہ بعد از وقت پہنچی تھی ۔ انگریا انگریزی بیڑے کے حملہ آور ہونے سے پہلے ہی جنوب کی طرف فرار ہو گیا ۔ انگریزی جہازوں نے اس کا تعاقب کیا مگر وہ ہاتھ نہ آیا ۔ واپس آ کر انگریزوں نے انگریا کے سورن درگ کے قلعوں پر حملہ کیا اور بہ سہولت ان پر قابض ہو گئے ۔ اس فتح کے بعد مئی میں کموڈور جیمز

بمبئی واپس آ گیا ۔

اسی زمانے میں کلائیو انگلستان سے بمبئی پہنچا ۔ بھیجا اس غرض سے لیا تھا کہ مرہٹوں کے ساتھ مل کر دکن میں فرانسسیوں اور ان کے اتحادیوں سے جنگ کرے ۔ لیکن بمبئی میں امیرالبحر واٹسن نے اسے انگریا کے خلاف جنگ میں الجھا لیا ۔ امیرالبحر نے جنگی جہازوں سے حملہ کرکے انگریا کا بیڑا غرق کر دیا ۔ کلائیو نے مرہٹوں کو ساتھ لے کر خشکی کے راستے گھیریا (وزیا درگ) کے قلعے کا محاصرہ کیا ۔ اس مرتبہ مرہٹہ افواج کو حملہ کی تمام تفصیلات سے بے خبر رکھا گیا تھا چنانچہ قلعہ جلد ہی فتح کیا جا سکا ۔ دس لاکھ روپیہ مال غنیمت ہاتھ آیا جسے انگریزوں نے آپس ہی میں تقسیم کر لیا ، اپنے اتحادی مرہٹوں کو اس میں سے کچھ نہ دیا (۴) گھیریا کا قلعہ تسخیر ہونے کے بعد انگریا کی کمر ٹوٹ گئی اور انگریزوں کو اس سے کسی قسم کا خدشہ نہ رہا ۔ پرتگیزوں کا زور پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا ۔ مرہٹے ان سے سالسٹ ، گھوربندر ، بسین اور تنا کے مقامات لے چکے تھے ۔ لہذا ہند کے مغربی ساحل پر یوروپین طاقتوں میں سے انگریز اب سب سے بڑی طاقت بن گئے ۔

ہند پر برطانوی تسلط کی راہ میں مرہٹوں کے علاوہ اب کوئی اور خاص رکاوٹ باقی نہ رہی تھی ۔ اورنگ زیب کی یلغار مرہٹوں میں قومی اتحاد اور مذہبی شعور بیدار کر چکی تھی چنانچہ یہ لوگ مغل اقتدار کا شیرازہ بکھیر کر ملک پر اپنا تسلط قایم کرنے میں برابر کامیابی حاصل کرتے جا رہے تھے لیکن ان کی عدیم المثال کامیابی نے ان کے درمیان کسی قسم کا قومی اتحاد پیدا نہ ہونے دیا ۔ ادھر ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے

میدان کی جنگ نے مرہٹہ اقتدار کو پانچ ریاستوں میں تقسیم کر ڈالا ۔ ان پانچ ریاستوں کا سربراہ اعلیٰ پیشوا کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور پونا میں اس کا دارالحکومت تھا ۔ بھونسلا خاندان کا صدر مقام ناگ پور ، سندھیا خاندان کا صدر مقام گوالیار ، ہولکر خاندان کا دارالحکومت اندور اور گیکواڑ خاندان کا دارالحکومت بڑودہ تھا ۔ ان مرہٹہ سرداروں میں سب سے ذہین مہاراجی سندھیا اورتوکوجی ہولکر تھے ۔ دہلی میں شاہ عالم کی برائے نام حکومت بھی ان ہی کے زیر اثر تھی ۔ ان ہی کی افواج ہندوستان میں ادھر آدھر چھاپے مار کر تاوان وصول کرتی پھرتی تھی ۔ کبھی کبھی بنگال پر بھی جو اب انگریزوں کے زیر تسلط تھا چڑھائی بول دیتیں اور انگریزوں کے لیے پریشانی کا موجب بن جاتی تھیں ۔ چنانچہ ہندوستان میں اب صرف دو بڑی قوتیں باقی رہ گئی تھیں ایک مرہٹےدوسرے انگریز ۔ ایک نہ ایک دن ان دونوں کا تصادم لازمی تھا اس کی صورت ۱۷۷۹ء میں بن گئی ۔ اس زمانے میں پونا کی پیشوائی کے لیے دو دعوے دار اٹھ کھڑے ہوئے ، ایک رگو باراؤ جس نے سابق پیشوا کو زہر دے دیا تھا اور اس کے بعد اپنے حقوق ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا دوسرے مادھو راؤ جو جائز اور قانونی طور سے واقعی پیشوا بننے کا مستحق تھا ۔ کمپنی کسی ایسے ہی موقعے کی تاک میں تھی ، دونوں حریفوں کے نزاع میں کمپنی کو ایک طرف علاقے کی توسیع کا امکان نظر آیا ، دوسری طرف پونا کے پیشوا کو مٹھی میں لے لینے کی صورت دکھائی دی ۔ تمام متعلقہ امور پر غور کرنے کے بعد رگو باراؤ کی حمایت زیادہ نتیجہ خیز نظر آئی ۔ اس پر سادھو راؤ کے وزیر نانا خبر نویس نے اپنی معاولت کے لیے حیدر آباد سے فرانسیسیوں

کو دعوت دے دی ۔ ان دنوں برطانوی ہند کا گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز تھا ۔ اسے اس وقت نہ مرہٹوں سے الجھنا پسند تھا نہ کمپنی کی پالیسی سے اتفاق تھا لیکن کمپنی نے گورنر جنرل کی مخالفت کو نظر انداز کر دیا اور رگوباراؤ کی امداد اس شرط پر کرنے کا فیصلہ کیا کہ وہ سالسٹ کا جزیرہ اور بسین کی بندرگاہ کمپنی کی تحویل میں دے دے ۔ برطانوی فوج کے ایک دستے نے چھپاک سے سالسٹ پر قبضہ کر لیا اور پونا پر چڑھائی بول دی لیکن اس موقع پر کمپنی نے مرہٹوں کی طاقت کا اندازہ صحیح نہ لگایا تھا ۔ پونا پر چڑھائی بری طرح ناکام ہوئی اور کمپنی کو سخت شرمندگی اٹھانی پڑی ۔ وارگوان کنونینشن منعقد کی گئی جس میں کمپنی نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا ۔ ادھر لارڈ ہیسٹنگز نے برطانوی وقار کو خطرے میں دیکھا تو اپنے تجربہ کار جرنیلوں کی زیر قیادت کمک بھیج دی ۔ اس فوج نے گوالیار کے قلعے اور گجرات کے صوبے پر قبضہ کر لیا ۔ ان فتوحات کے باعث معاہدہ امن پر دستخط کے وقت کمپنی کا وقار قدرے سنبھل گیا ۔ ۱۷۸۲ء میں معاہدہ سالبائی ہوا جس کی رو سے گجرات کا صوبہ مرہٹوں کو واپس کر دیا گیا اور رگو باراؤ کو چھوٹا پیشوا قرار دیا گیا۔ اس کے عوض کمپنی کو سالسٹ کے علاوہ بمبئی کے ساحل سے دور دو اور جزیرے ضرور مل گئے مگر انگریزی اقتدار کے لیے یہ جنگ کچھ کامیاب قرار نہیں دی جا سکتی ۔

جب ہیسٹنگز کی فوجوں نے بھنڈاریوں کا قلع قمع شروع کیا تو اس موقع پر اس نے سوچا کہ مرہٹوں سے نپٹنے کا بھی اس سے بہتر موقع ہاتھ نہیں آسکتا ۔ چنانچہ اس نے پونا کے پیشوا پر دباؤ ڈالا ۔ معاہدہ بسین کے علاوہ ایک اور معاہدے پر بھی

دستخط کرے - اس معاہدے کی رو سے وہ مکمل طور پر کمپنی
کا دست نگر ہو جاتا تھا اور اس کی حیثیت ایسی نہ رہتی تھی
کہ مرہٹوں کی پیشوائی کا دعویٰ کر سکتا - اسے اپنے علاقے
میں انگریز فوج رکھنی پڑتی اور اس کے جملہ اخراجات برداشت
کرنے کے علاوہ ایک علاقہ بھی اس کے لیے مخصوص کرنا پڑتا۔
یہ مطالبات پیشوا کسی صورت منظور نہ کر سکتا تھا چنانچہ
تنگ آمد بجنگ آمد اس نے کیرکی پر جہاں ایک انگریز رجمنٹ
مقیم تھی حملے کا حکم دے دیا لیکن کیرکی پر یہ حملہ نا کام
رہا - پیشوا کی فوجیں پسپا ہو رہی تھیں کہ ان کا سامنا تازہ
دم انگریز فوج سے ہو گیا جس نے یرودا کے مقام پر پیشوا کی
فوج کو شکست فاش دی - جب پیشوا کی فوج کیرکی پر
حملہ کر رہی تھی تو دوسری طرف ناگ پور کے راجہ بھونسلا
نے سیتا بلدی کی مقیم انگریز فوج پر حملہ کر دیا لیکن یہ حملہ
بھی کامیاب نہ ہوا - ایک ماہ بعد راجہ بھونسلا کو اپنے
دارالحکومت کے باہر ہزیمت اٹھانی پڑی اور ناگ پور کے شہر
پر انگریز قابض ہو گئے۔ ادھر سندھیا کو کمپنی کی افواج نے
اسی طرح گھیر رکھا تھا اس لیے کوئی حرکت کرنا ممکن نہ
رہا تھا - مرہٹہ اقتدار کی حفاظت کے لیے آخر راجہ اندور کو
میدان میں اترنا پڑا - جسونت راؤ ہولکر نے کبھی شجاعت میں
بڑا نام پیدا کیا تھا مگر وہ مر چکا تھا - اس کا بیٹا ابھی کمسن
تھا پھر بھی اس کی فوجوں نے بہت ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن
ماھد پور کے مقام پر آخر شکست کھائی - انگریزوں کے لیے اپنا
مقصد حاصل کرنا اب بائیں ہاتھ کا کھیل تھا - فروری ۱۸۱۸ء
میں مرہٹوں کی آخری مزاحمت بھی آشتی کے مقام پر ختم کر
دی گئی۔ اس کے بعد ایک ایک کرکے مرہٹوں کے سب قلعوں

پر انگریزوں کا قبضہ ہوتا چلا گیا ۔

راجہ بھونسلا کو جلا وطن کرکے ایک بچے کو انگریزوں کی سرپرستی میں ناگ پور کا حکمران تسلیم کیا گیا ۔ سندھیا اور ہولکر کو مزید علاقوں سے محروم کرکے انگریزوں کے ایجنٹ کی حیثیت سے حکمراں رہنے دیا گیا ۔ پیشوائی ختم کرکے پیشوا کی پنشن مقرر کر دی گئی ، اس کے علاقے پر کمپنی نے قبضہ کر لیا ۔ سیواجی کے ایک گمنام جانشین کو تلاش کرکے اس شرط پر مرہٹہ حکومت کا برائے نام سربراہ بنا دیا گیا کہ وہ ہر کام کمپنی کے کیپٹن گرانٹ کے اشارے پر کیا کرے گا ۔

اس طرح مرہٹہ اقتدار کا جنازہ اٹھ گیا ۔ انگریز تاجر جو کاروبار کے لیے ہندوستان آئے تھے ، صرف پنجاب کو چھوڑ کر پورے ہند کے واحد مالک بن گئے اور ہند پر برطانوی حکومت نے ایک مسلمہ حقیقت کی صورت اختیار کرلی ۔

---

1. Empire of the Nabobs by Lester Hutchinson.
2. Early History of the Bhonsleys of Sitara, by H. B. E. Frere.
3. Ibid.

ضمیمہ دوم

بمبئی کے قدیم تھیئٹر ہال

۱۵ - ۱۹۱۹ع تک یہاں (بمبئی میں) ایک بھی ایسا تھیئٹر ہال موجود نہ تھا جہاں انسان تجربہ کار، نامور اور منجھے ہوئے اداکاروں کے فن کی بدولت ایک اچھے تماشے میں ذہنی آسودگی کی چند ساعتیں گزار سکتا......کچھ عرصے پہلے تک یہاں کے تھیئٹروں کی عمارتوں کی لوہے کی ٹوٹی پھوٹی چادروں کو بدنما رنگوں سے رنگ لیا جاتا تھا۔ ان کے پردے اور ڈراپ سین بھی ان عمارتوں کی بیرونی بد صورتی ہی کے آئینہ دار تھے۔ علاوہ بریں یہ تھیئٹر گرانٹ یا فاک لینڈ روڈ پر ایسے ماحول میں واقع تھے جس کا ذکر نا گفتہ بہ ہے۔

اولین عمدہ تھیئٹر کی جدید عمارت ۳۵ برس پہلے ایک جوشیلے شوقیہ فن کار نے داؤد بائی روڈ کے شمال مشرق کونے پر تعمیر کی۔ اس کی تعمیر میں بمئی کے اس وقت کے گورنر رچرڈ ٹمپل کی حوصلہ افزائی کو بڑا دخل تھا۔ اس تھیئٹر کا نام "گائٹی" تھا۔ یہ تھیئٹر کے جدید اور مہذب تقاضوں پر پورا اترتا تھا۔ اس تھیئٹر کا کرتا دھرتا میجر کاپر تھا۔ اس نے ایک ڈرامہ کمپنی تشکیل کی جس نے اس وقت انگلینڈ کے کئی مقبول ڈرامے سٹیج کیے۔

۱۸۸۰ع سے ۱۹۰۰ع تک ایک خلا کی سی کیفیت رہی

حتٰی کہ بیسویں صدی کے آغاز میں ریوسن سٹریٹ میں ایکسلشئر نامی تھیئٹر کی عمارت معرض وجود میں آئی ۔ یہ عمارت فن تعمیر کا نمونہ تھی اور اس کے آڈیٹوریم میں کئی آسائشوں کو مدنظر رکھا گیا تھا۔ اس کے قریب ہی ہارنی بائی روڈ پر امپائر تھیئٹر واقع ہے لیکن اس کی عمارت ایکسلشئر جیسی خوبصورت نہیں ۔ ہگز روڈ پر رائل اوپرا ہاؤس بھی عمدہ تھیئٹر ہے لیکن یہ سال میں بمشکل چار ماہ کھلا رہتا ہے ۔

اگرچہ اس وقت بمبئی میں تین ایسے اچھے اور آرام دہ تھیئٹر موجود ہیں جہاں دن بھر کی تھکاوٹ کے بعد انسان دو تین گھنٹے آرام سے گزار سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں ابھی تک ایسی کوئی ڈراما کمپنی نہیں آئی جو ڈرامے کے صحیح قدر دانوں اور ناقدین فن سے داد وصول کر سکے ۔ خیال ہے کہ کسی ایسی ڈراما کمپنی کے لیے بمبئی کو ابھی خاصی مدت انتظار کرنا پڑے گا لیکن یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ پہلے بینڈ مین کمپنی نے اور بعد میں مسز براؤن پورٹر نے شیکسپیئر کے بعض ڈرامے نہایت عمدگی سے سٹیج کیے ۔

پچاس برس پہلے ڈرامے کے شائقین کو جو سہولتیں میسر تھیں ، ان کا ذکر یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ۔ اس وقت کے بمبئی کے قدیم واقعہ نگار بتاتے ہیں کہ پرانے بمبئی گرین کے قریب فورٹ میں ایک تھیئٹر ہوا کرتا تھا۔ اس پر لوگوں نے جابجا دستخط کر رکھے تھے جن سے پتا چلتا تھا کہ وہ ۱۷۷۰ع میں تعمیر کیا گیا تھا ۔ اس تھیئٹر کو احاطہ خیال میں لانے کے لیے ہمیں اپنے تصور کو ماضی میں بہت دور لے جانا ہوگا ۔ اس کی داخلی اور خارجی شکل و صورت کیسی تھی، قدیم واقعہ نگار اس سلسلے میں کچھ نہیں بتاتے ۔ زیادہ سے زیادہ اتنا ہی

پتا چلتا ہے کہ اس کا انتظام ایک ٹرسٹ کے سپرد تھا - اس عمارت کی قدر و منزلت کی تصدیق اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ اپنی خستہ حالی کے باوجود یہ عمارت ۱۸۰۸ء تک کھڑی تھی - اس زمانے کا یہی ایک ڈراما گھر تھا اور گمان غالب ہے کہ وہ تھیئٹر کے تمام مقاصد پورے کرتا تھا -

اس نے نصف صدی تک جدو جہد سے بھرپور زندگی گزاری - ۱۸۱۹ء میں اس کے شکستہ صحن اور بوسیدہ در و دیوار کی مرمت کرائی گئی جس کے لیے ۱۰۰۰ روپے بطور فنڈ جمع کیے گئے - لیکن اخراجات ۲۳۰۰۰ روپے تک پہنچ گئے -

ان دنوں جب کہ روپیہ عنقا تھا اور لبڈن ہال سٹریٹ میں پرانی کمپنی مالی خستہ حالی کا رونا رویا کرتی تھی ، یہ ایک خطیر رقم تھی - ظاہر ہے کہ روپے کی قوت خرید بہت زیادہ تھی کیونکہ اس زمانے کے تاجر اپنے روپے کو ۲۲ سے ۲۴ شلنگ کے برابر سمجھتے تھے اور تبادلہ زر ایک دل خوش کن کاروبار سمجھا جاتا تھا - ۲۳۰۰۰ روپے کا زیادہ حصہ پرائیویٹ بنکرز ، میسرز فوربز اینڈ کمپنی نے دیا جس کا سر براہ چارلس فوربز تھا -

پھر خاموشی کا ایک زمانہ آتا ہے جس میں اس ڈرما گھر کو گاہے گاہے برے دن دیکھنے پڑے - چلانے کے لیے روپیہ قرض لینا پڑا جو انجام کار اس کے ضامنوں نے ادا کیا - خسارہ چودہ ہزار روپے تھا -

انیسویں صدی کے اوائل میں ایک اور نامور تھیئٹر بنا جس کا نام آرٹلری تھیئٹر تھا - یہ ماتنگا میں واقع تھا جہاں مضافات کے خوبصورت مناظر میں (جنھیں صنعت کاری نے اب بے حد بد وضع بنادیا ہے) ڈرامائی "رنگ رلیاں" منائی جاتی تھیں -

یہ بات ریکارڈ میں درج ہے کہ ۱۸۲۰ء میں بمبئی کے چیدہ چیدہ لوگ جن میں گورنر بھی شامل تھا ، "جوان لڑکی اور "قفل" نامی کھیل دیکھنے وہاں آئے۔ تھیٹر کے قریب ہی ایک بڑے مکان میں ضیافتوں اور بال ڈانس کا انتظام بھی کیا جاتا تھا جسے بعد میں سر ڈاشا ، ایم ۔ بنٹ نے خرید لیا تھا ۔

۱۸۴۲ء کا سال بمبئی کے ڈراما اور میلو ڈراما میں تاریخی حیثیت رکھتا تھا ۔ عظیم شنکر سیٹھ نے جس کا پورا نام جگن ناتھ شنکر سیٹھ تھا ، گرانٹ روڈ پر اپنی زمین کا ایک ٹکڑا ایک نئے تھیٹر کی تعمیر کے لیے مختص کر دیا ۔ یہ تھیٹر وکٹورین عہد کی ابتدائی طرز تعمیر کے مطابق تیار ہونا تھا لیکن اس بش کش پر غور کرنے اور اسے قبول کرنے کے لیے اس علاقے کے باشندوں پر مشتمل ایک جلسہ عام منعقد کرنے کی ضرورت پڑی ۔

ان دنوں گرانٹ روڈ پر سر روجرڈی ناریا (جو سرجمشیدجی جی ۔ جی بھائی کا دوست تھا) کے امیر خاندان کے افراد اور ڈی گاس نامی پرتگالی خاندان رہتے تھے ۔ جلسہ عام نے تھیٹر کی اصلی جگہ نامنظور کر دی ۔ بہر حال جگن ناتھ شنکر سیٹھ نے گرانٹ روڈ پر ایک دوسری جگہ تھیٹر کی عمارت تعمیر کی اور اس کا نام گرانٹ روڈ تھیٹر رکھا ۔ یہ تھیٹر اپنا کام بخوبی انجام دیتا رہا حتی کہ ۱۸۷۰ء کے بعد شہر کے ایک دوسرے حصے میں ٹین اور لوہے سے بنے ہوئے کئی تھیٹر برساتی مینڈکوں کی طرح وجود میں آ گئے ۔ یہ تھیٹر اپنے گرد و پیش کے نچلے طبقے کے لیے تفریحی سامان مہیا کرنے کے علاوہ آوارہ عورتوں کے حسن کی نمائش گاہوں کا مقصد بھی پورا کرتے تھے ۔ پھر تقدیر کا کرنا یوں ہوا کہ گرانٹ روڈ تھیٹر کو

اپنی خوش حال زندگی کے پچاس برس مکمل کرنے کے بعد ایک بیکری میں منتقل کر دیا گیا جس کا مالک فری بورن نامی ایک شخص تھا جو گورنمنٹ سیونگ بینک کا ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ تھا۔

(ترجمہ از مانی برکونکشنز آف بمبئی)

ضمیمہ سوم

کلکتہ کے مستقل قومی تھیٹر کے کھیل

میں نے متعدد مرتبہ ان قدیم سنسکرت ڈراموں کا ذکر کیا ہے جو اب بھی کبھی کبھی ہندوستان میں تمثیل کیے جاتے ہیں[1] - کبھی اصلی زبان میں اور کبھی ہندوستان کی عام زبان میں لیکن جو چیز اس زمانے تک نظر نہ آتی تھی یعنی ایک سچا ہندوستانی تھیٹر ، ایک مستقل قومی تھیٹر ، وہ بھی اب کلکتے میں قائم ہو گیا ہے - جس میں ملکی باجوں کا آرکسٹرا ہے اور عورتوں کی بجائے لڑکے اداکاری کا کام انجام دیتے ہیں -

انگریزی اخبارات نے اپنے نامہ نگاروں کے حوالے سے ایک ہندو کامیڈی کی جو اس تھیٹر میں تمثیل کی گئی ، روداد شائع کی ہے - یہ ایک معمر برہمن کا قصہ ہے جس کی دو لڑکیاں بیوہ ہیں اور جو خود ایک نیچ ذات کی عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے - یہ تجویز آزادانہ ہے اور یہ کشمکش قابل دید ہے - اس کی لڑکیاں اس بے جوڑ رشتے کی بہت مخالف ہیں - بہر حال ان کی ناراضی کی اصل وجہ یہ نہیں بلکہ محض یہ ہے کہ ہندی سماج کے اصول کے مطابق ان کی دوبارہ شادی نہیں ہو سکتی

---

۱ - گذشتہ جنوری میں فرید پور کے بازار میں لوگوں کی دلچسپی کے لیے ایک کھیل رام بیساکھ کے نام سے پیش کیا گیا اور مقبول ہوا تھا (انڈین میل ۸ - جون ۱۸۷۳ء)

اور انھیں سوتیلی ماں کو برداشت کرنا پڑے گا ۔

جو چیز ہمیں اس قصے میں عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے ، وہ یہ ہے کہ دونوں اس پر افسوس کرتی ہیں کہ سرکارِ انگریزی نے ستی کی ممانعت کر دی ۔ ان کے خیال میں ستی حالت بیوگی سے کہیں زیادہ بہتر ہے[1] ۔ خوش قسمتی سے بوڑھا برہمن

---

۱ ۔ یہ بالکل درست ہے کہ ہندوستانی عورتوں کو اس وحشیانہ رسم کے مٹ جانے کا افسوس ہے ۔ کچھ دن ہوئے ، متوفی راجہ جودھپور کی درجن بھر بیویاں اور بکثرت خواصیں بڑی خوشی سے ان کی چتا پر جل مرنے کو تیار تھیں مگر انھیں بڑی مایوسی اس وجہ سے ہوئی کہ نئے راجہ نے جو بہ قول ہندوستانی اخبارات کے یورپ زدہ ہیں انھیں اس بات کی اجازت نہیں دی ۔

حال ہی میں ''ناما تارا'' واقع ٹونک میں ایک برہمن مر گیا اس کی بیوی ستی ہو جانا چاہتی تھی لیکن چونکہ سرکار نے اس رسم کی ممانعت کردی تھی ، اس لیے ناما تارا کے ایجنٹ نے کچھ سواروں کو نگرانی پر مقرر کیا اور اس عورت کو نظر بند کر دیا ۔ جب ہندو رسم کے مطابق برہمن کی لاش چتا پر رکھی جا چکی اور آگ لگائی جانے والی تھی ، عورت کسی ترکیب سے دروازہ کھول کر نکل بھاگی ۔ سپاہیوں نے اس کا پیچھا کیا ۔ وہ اپنے شوہر کی چتا میں گر کر جل مرنے ہی کو تھی کہ ایک مسلمان نے اس کا بازو پکڑ لیا ۔ اس پر اسے بہت غصہ آیا اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر اس نے اس شخص کو بد دعا دی ۔ اے بھگوان ! یہ شخص مجھے اپنے شوہر کا ساتھ دینے کی نیکی سے روکتا ہے ، اسے اس گناہ کی سزا دے اور اگر تو میری قربانی قبول کرنی چاہتا ہے تو مجھے اپنے شوہر کے ساتھ جا ملنے کی اجازت دے ۔ یہ الفاظ وہ کہتے کہتے ختم ہو گئی اور اس طرح اس نے اپنے شوہر کا ساتھ دیا ۔ (پنجابی مورخہ ۱۴ ۔ جون ۱۸۷۳ع)

بہت پس و پیش کے بعد اپنے ارادے سے دست بردار ہوجاتا ہے۔

اخبارات نے ایک اور کامیڈی "نو سو روپے" کا بھی ذکر کیا ہے ، جو کسی اور موقع پر کھیلی بھی گئی تھی ۔ اس کے چھ ایکٹ اور اٹھارہ مناظر ہیں اور کھیل کا وقت پانچ گھنٹے ہے ۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ ایک باپ شادی کے ایک دلال کے مشورے پر نو سو روپے کے عوض اپنی لڑکی کی شادی کر دینا بلکہ اسے بیچ ڈالنا چاہتا ہے ۔ دلال ایک شوہر یعنی ایک خریدار فراہم کرتا ہے ۔ لیکن ہونے والی دلہن کا چچا جو حشیش بہت پیتا ہے ، اسے اس سے زیادہ قیمت پر بیچنا چاہتا ہے، لڑکی بے ہوش ہو جاتی ہے ۔

ایک ڈاکٹر ، ایک ہومیوپیتھک معالج اور ایک (حکیم) بلایا جاتا ہے ۔ چچا ان طبیبوں کا مذاق اڑاتا ہے اور بالآخر کہتا ہے کہ لڑکی کی بیماری مرض عشق کے سوا کچھ نہیں ۔ جس شخص سے اسے محبت ہے ، وہ بلایا جاتا ہے لیکن اس کے پاس مقررہ رقم موجود نہیں اور پھر عاشق و معشوق کے نسب میں بھی کچھ فرق ہے ۔ لیکن چھٹا ایکٹ بہ خیر و خوبی ختم ہوتا ہے ۔ روپے بھی فراہم (ہو) جاتے ہیں ، دونوں کا نسب بھی ایک ہی ثابت ہوتا ہے اور حشیش کا عادی اس عادت بد سے توبہ کر لیتا ہے ۔

میں ایک اور ڈرامے کا ذکر کروں گا جو اس تھیٹر میں بڑی کامیابی سے پیش کیا گیا تھا ۔ میرا اشارہ "نیل درپن" کی طرف ہے جس کی وجہ سے سرکار کو ۱۸۶۷ع میں اچھی خاصی فکر پیدا ہو گئی اور جس کی وجہ سے ریورنڈ جے ۔ لانگ (Rev. J. Long) کو کئی مہینے کی سزائے حبس برداشت کرنی پڑی ۔ وجہ یہ تھی کہ اس میں نیل استعمال والوں پر سخت حملے

کیے گئے تھے ۔ تمثیل کے وقت ان حملوں کا لہجہ بہت نرم کر دیا گیا اور جہاں ضرورت تھی ڈرامے میں کانٹ چھانٹ کی گئی ۔ (مقالات گارسین دتاسی، جلد اول صفحہ ۳۳۳ - ۳۳۵ ، مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۴۳ع) ۔

ضمیمہ چہارم

نیا ہندوستانی تھیٹر

سنسکرت کے پرانے ڈرامے جو آج عوام، حتیٰ کہ اچھے خاصے شائستہ اور تعلیم یافتہ طبقوں کے لیے بھی ناقابل فہم ہیں انھیں یورپی علما نے بڑے عمدہ انداز میں بیان کیا ہے[1]۔ لیکن آج کے ہندوستانی جن کھیلوں سے محظوظ اور لطف اندوز ہوتے ہیں، ان کے متعلق جہاں تک مجھے معلوم ہے، بہت کم لکھا گیا ہے۔ اسی لیے میں یہ امید کرنے میں حق بجانب ہوں کہ اس میدان میں میرے ذاتی تجربے اور مشاہدے، محدود ہونے کے باوجود میرے قارئین کے لیے قابل قبول ہوں گے۔

غالباً لندن اور لاہور میں اتنا فرق نہیں ہے، جتنا لندن کی ڈروری لین میں کھیلے جانے والے کھیل مثلاً "دی سنز آف سوسائٹی" (The sins of society) اور لاہور کے بازار انارکلی میں کھیلے جانے والے کھیل مثلاً "اندر سبھا" کے درمیان پایا جاتا ہے۔

جن کھیلوں کا میں یہاں ذکر کرنے والا ہوں، وہ عارضی طور پر لگائے ہوئے سائبانوں تلے کھیلے گئے، محض اس لیے کہ

۱۔ مثلاً آر ڈبلیو فریزر، ایل ایل بی کی تصنیف "اے لٹریری ہسٹری آف انڈیا" باب ۱۲۔ اور پروفیسر ایچ ایچ ولسن کی کتاب "تھیئٹر آف ہندوز" دو جلدوں میں۔ (مضمون نگار)

پنجاب کے دارالحکومت اور غالباً شمالی ہندوستان کے کسی شہر میں بھی مستقل نوعیت کے تھیٹر یا ایسے کھیلوں کے لیے موزوں جگہ نہیں ہے ۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ، کلکتے میں دو تین مستقل تھیٹر بنے ہوئے ہیں ، لیکن افسوس کہ میں ان میں سے ایک بھی نہ دیکھ سکا ۔

الہ دین کا چراغ :

مارچ کی ایک شام میں اپنے ایک دوست کے ہمراہ پارسی تھیٹریکل کمپنی کا کھیل "الہ دین کا چراغ" دیکھنے گیا ۔ تھیٹر عارضی طور پر لاہور میں میو ہسپتال کے قریب بنایا گیا تھا ۔ ایک لمبے چوڑے سائبان کے وسط میں فانوس لٹکا ہوا تھا جس میں چار شمعیں تھیں ۔ دائیں بائیں دو چوبی کھمبوں پر دیواری لیمپ آویزاں تھے ۔ ان سب کے مجموعے سے جو روشنی تھیٹر میں ہوئی ہو گی ، اس کا آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں ۔ ان چھ شمعوں کے علاوہ سٹیج کے سامنے ایک طرف سے ڈھکی ہوئی روشنیوں کی قطار بھی تھی ۔ بس پورے تھیٹر میں روشنی کا یہی انتظام تھا ۔ سٹیج پر تو فانوس کی وجہ سے کچھ ہلکی ہلکی روشنی موجود تھی ، باقی سارا پنڈال نیم تاریکی میں تھا ۔ میں اور میرا دوست کھیل شروع ہونے سے تقریباً بیس منٹ پہلے تھیٹر میں پہنچے ۔ یہ اونچے طبقے کے سوا دیسی لوگوں کے ہر طبقے سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا ۔ اگلی قطاروں میں نچلے طبقے کے کچھ یورپی اور اینگلو انڈین بھی موجود تھے ۔ ان میں سے چند معزز خواتین بھی شامل تھیں جو نیم عریاں لباس پہنے ہوئے تھیں ، اور ظاہر ہے کہ یہ خاص لباس انھوں نے اس موقع ہی کے لیے پہنا تھا ۔

سٹیج یورپی طرز کا بنایا گیا تھا جس میں کئی فرشی دروازے اور اوپر پہنچانے والی خود کار سیڑھیاں لگی ہوئی تھیں تاکہ اس کہانی میں بار بار آنے والا جن اچانک نمودار اور غائب ہو سکے ۔

ڈراما اُردو زبان میں کھیلا گیا ، یوں کہیے کہ گایا گیا ۔ خاص خاص موقعوں کے سوا پورے کھیل کے دوران میں مکالمے تک سارنگی اور طبلے کے ساتھ ادا کیے گئے ۔ میں موسیقی سے لبریز تماشے کے لیے تیار نہیں تھا ۔ مکالموں اور لفظوں کو سمجھنا میرے لیے دشوار ہو رہا تھا جو اداکاروں کی زبان کی بجائے ، ناک سے نکلتے ہوئے محسوس ہوتے تھے ۔

اس کمپنی میں دس پارسی تھے اور ایک نوجوان انگریز عورت ، جسے بد قسمتی گھیر گھار کر اس گھومنے والی کمپنی میں لے آئی تھی جس کا ایک ایک فرد مختلف ذات اور نسل سے تعلق رکھتا تھا ۔

پردہ اٹھا ، ایک کالا بھجنگ ، گھنی ڈاڑھی والا ، موٹا تازہ شخص نمودار ہوا جو ایک چھوٹی سی میز کے سامنے کھڑا تھا ۔ میز کے عقب میں عرق کھینچنے کے آلے اور کٹھالیاں وغیرہ رکھی ہوئی تھیں ، جن میں گویا جادو کا مسالہ تیار ہو رہا تھا ۔ اس شخص کے ہاتھ میں ریت گھڑی تھی ۔ یہ اس کہانی کا مشہور جادوگر تھا ۔ ریت گھڑی سے ایک دو بار اچھی طرح مشورہ کر لینے کے بعد اس نے میز کے نیچے پستول کا فائر کیا ۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی ایک پری نمودار ہوئی ، بلکہ زمین میں سے نکلی ۔ وہ پری سے مختصر سی گفتگو کے بعد ایک انگوٹھی لیتا ہے ۔ پری جس طرح اچانک نمودار ہوئی تھی ، اسی طرح اچانک غائب ہو جاتی ہے ۔ وہ شخص انگوٹھی

رگڑتے ہوئے دوبارہ فائر کرتا ہے ۔ اس مرتبہ جنوں کا بادشاہ نمودار ہوتا ہے ۔ جادوگر جنوں کے بادشاہ سے معلوم کرتا ہے کہ الہ دین کا چراغ کیوں کر حاصل کیا جا سکتا ہے ؟

سٹیج پر جب یہ کارروائی ہو رہی ہوتی ہے تو فرش پر ایک طرف ایک کالا شخص لیٹا رہتا ہے جس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی ۔ جادوگر اسے ٹھوکر مارتا ہے اور وہ گھبرا کر کھڑا ہوجاتا ہے۔ اب تماشائیوں کے سامنے ایک گم‌سم بدھو سا حبشی غلام ہے جو آئندہ ہر آنے والے منظر میں ضرور موجود ہو گا اور کم و بیش غیر متعلق اور مضحکہ خیز کردار ادا کرے گا ۔

جہاں تک مجھے یاد ہے ، یہ کردار الف لیلہ میں نہیں ہے ۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ آج کل کے ہندوستانی تھیٹر کے قوائد و ضوابط ، بلکہ ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ایجاد کیا گیا ہے ۔ اس کی مثال قدیم زمانے کے تھیٹر کے اس مسخرے کی سی ہے جو ہر وقت بادشاہ کی ہمراہی میں رہتا تھا ، اور اس کی ذات میں تیز سوجھ بوجھ اور جبلی نکتہ سنجی کے ساتھ ساتھ روٹی کپڑے کا لالچ بھی شامل ہوتا تھا[1] ۔

اگلا منظر ایک بازار کا تھا ۔ الہ دین اور اس کے دوسرے نوجوان دوست رقص گاہ میں ہنس کھیل رہے تھے، شور مچا رہے تھے ، لڑ جھگڑ رہے تھے کہ الہ دین کی بوڑھی ماں آئی اور بے تکلف رستہ بناتے ہوئے اپنے گستاخ اور بد مزاج لڑکے تک پہنچی ، اور اسے ایک طرف لے جا کر جھڑکیاں دینے لگی ، نصیحتیں کرنے لگی کہ یہ طفلانہ حرکتیں چھوڑو ، آدمی بنو اور عقل کی باتیں کرو۔ اس منظر میں ماں اور بیٹے کی اداکاری

---

۱ ۔ ”دی ماڈرن ہندو ڈراما“ مصنفہ بابو کشوری چند مترا ، مطبوعہ ”کلکتہ ریویو“ جلد ہفتم ۔ (مضمون نگار)

اچھی تھی ، خاص طور پر اس بوڑھی عورت نے تو کمال کر دیا ۔ ان دونوں کی اداکاری دیکھ کر میں یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہو گیا کہ کمپنی کے بعض اداکار واقعی با صلاحیت فن کار ہیں ۔

مشرق و مغرب کی نئی نسلوں کا دل لبھانے والی اس مشہور کہانی کے مناظر جوں جوں یکے بعد دیگرے سامنے آ رہے تھے ، جوں جوں بغداد کے گلی کوچوں میں آوازیں لگائی جا رہی تھیں کہ "پرانے چراغوں کے بدلے نئے چراغ لے لو !" عیار جادو گر رفتہ رفتہ الہ دین کو اپنے جال میں پھانس رہا تھا ، جنوں کا بادشاہ چراغ کے مالک کے حضور میں بار بار پیش ہو رہا تھا ، غائب ہو رہا تھا ، غرض ہر نئے منظر کے ساتھ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ کہانی جو مشرق کی فضا اور روایت کے عین مطابق ہے ، جو مشرق کی زبان میں کھیلی جا رہی ہے ، جو مشرقی تماشائیوں کے سامنے کھیلی جا رہی ہے ، جو مناسب قدرتی ماحول رکھتی ہے ، یہاں تو اتنی غیر فطری اور بعید از قیاس نہیں رہی جتنی کہ اصل میں ہے ۔ فی الحقیقت یہ سچے اور ممکن واقعات کی ترجمان معلوم ہوتی ہے ۔ سچ پوچھیے تو میں اس وقت ایسیا کی باطنیت اور طلسماتی فضا میں مسحور ہو گیا تھا ۔

جیسا کہ میں نے اوپر بھی ذکر کیا ہے ، اس کمپنی میں صرف ایک عورت تھی اور وہ بھی بوڑھی ۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کی باقاعدہ سٹیج پر عورتیں بالکل حال ہی میں نمودار ہونا شروع ہوئی ہیں ، اگرچہ بنگال کے پنچلی[1] ڈراموں میں نسوانی کردار ہمیشہ سے عورتیں ہی ادا کرتی چلی آ رہی ہیں ۔ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کیونکہ انگلستان میں بھی

---

۱ ۔ دیکھیے اسی مضمون کا صفحہ ۲۹۶ ۔ (مؤلف)

ریسٹوریشن تک خواتین سٹیج پر نہ آئی تھیں ۔ تاہم یہاں میں اس امر کی جانب ضرور اشارہ کروں گا کہ جیسا کہ پروفیسر ایچ ایچ ولسن نے لکھا ہے ، پرانی ہندو سٹیج پر نسوانی کردار عام طور پر عورتیں ہی ادا کرتی تھیں ، اگرچہ اکثر صورتوں میں مرد یا لڑکے بھی عورتوں کا بھیس بدل لیا کرتے تھے ۔ "الہ دین کے چراغ" میں کوئی دیسی عورت نظر نہ آئی ، حتٰی کہ کوئی طوائف بھی نہیں ، حالانکہ تقریبا ہر تھیٹر میں اس کی موجودگی یقینی ہوتی ہے ۔ قدیم یونانی تھیٹر سے تو شریف عورتوں کو خارج کر دیا جاتا تھا ۔

اندر سبھا :

اب میں ایک ایسے ڈرامے کا ذکر کروں گا جو 'الہ دین کے چراغ' سے بالکل مختلف تھا ، ایک اور کمپنی نے ایک اور مقام پر کھیلا ۔ یہ مقبول اور جدید کھیل "اندر سبھا" ہے جو واجد علی شاہ ، سابق نواب اودھ کے حکم پر ایک مسلمان شاعر نے لکھا تھا[1] ۔

تھیٹر بانسوں کا کھڑا ہوا ایک بہت بڑا ڈھانچا تھا ، جس کے جوڑنے میں مہارت کا ثبوت نہیں دیا گیا تھا اور جو باریک کپڑے یا کینوس کی چادروں سے ڈھکا ہوا تھا ۔ سٹیج اچھی خاصی تھی اور روشنی بھی اچھی تھی ۔ تقریباً پندرہ شمعیں عکس اندازوں سمیت چکاچوند کر رہی تھیں ۔ بڑے احاطے میں کہیں کوئی شمع نہ تھی ، لیکن گرمیوں کی چاندنی کپڑے کی

---

۱ ۔ اردو ڈرامے کے اکثر طلبا جو جدید تحقیق سے نا واقف نہیں بخوبی جانتے ہیں کہ یہ ڈراما نواب واجد علی شاہ کے حکم سے نہیں لکھا گیا تھا بلکہ ان کے زمانے میں بعض احباب کے اصرار پر امانت نے لکھا اور بعد میں شہر کے ڈراما کے شائقین کی امداد سے پیش کیا گیا تھا ۔ (مؤلف)

چھت سے چھن چھن کر آ رہی تھی ۔ محفوظ نشستیں کرسیوں کی دو قطاروں پر مشتمل تھیں ۔ ویسی ہی دو قطاریں ذرا پیچھے فرسٹ کلاس کے لیے تھیں ۔ ایک جنگلا تھا رکاوٹ کے لیے اور پیچھے تو سیکڑوں تماشائیوں کے لیے نشستیں بے ترتیبی سے بکھری پڑی تھیں ۔ ٹکٹ تین روپے سے لے کر چار آنے تک تھے ، اور ایک خاص جگہ "دیسی خواتین" کے لیے الگ مخصوص تھی اور یہاں کا ٹکٹ فی نشست آٹھ آنے تھا ۔ لیکن اس تھیٹر میں دیسی خواتین مجھے کہیں بھی نظر نہ آئیں ۔

اعلان اور اشتہار کی رو سے کھیل ٹھیک نو بجے شروع ہونا تھا ۔ میں دو منٹ پہلے اپنی نشست پر بیٹھ گیا اور گھوم کر دیکھا تو تھیٹر بالکل خالی پڑا تھا ۔ پندرہ منٹ یوں ہی گزر گئے ۔ میں نے تنگ آ کر تھیٹر کے ایک ملازم سے پوچھا "کھیل کب شروع ہوگا ؟" اس نے کہا "نو بجے "۔ پھر اپنے لہجے میں معنویت پیدا کرتے ہوئے بولا "آپ جانتے ہیں لوگ ٹھیک وقت پر نہیں آتے" میں نے پوچھا "تو کیا تم لوگ اُن کا انتظار کرتے رہتے ہو ؟" بولا "جی ہاں ! انتظار کرنا ہی پڑتا ہے"۔ بیس منٹ اور گزر گئے ۔ پھر ساڑھے نو ہوگئے ۔ کھیل شروع ہونے کے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے اور نہ تماشائیوں میں جو اب خاصی تعداد میں جمع ہوگئے تھے اضطراب کی کوئی لہر اُٹھتی نظر آرہی تھی ۔ اس تاخیر سے مجھے اتنا فائدہ ضرور پہنچا کہ میں نے اپنے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے تماشائیوں کو اچھی طرح دیکھ لیا ۔

سب سے اگلی قطار میں ، مجھ سے آگے ایک اینگلو انڈین عورت زرد ساٹن کے لباس میں ملبوس بیٹھی تھی اور ظاہر ہورہا تھا کہ خاص اس موقع کے لیے تیار ہو کر آئی ہے ۔ اُس کے

پاس بطور نگران ایک لحیم شحیم شخص موٹے جھوٹے عام سے لباس میں بیٹھا تھا ۔ ساتھ ہی ایک بارہ تیرہ برس کا لڑکا تھا اور ایک لڑکی اُس سے ذرا چھوٹی ۔ اُس نے گہرے سرخ رنگ کی ساڑھی باندھ رکھی تھی ۔ چھوٹی سی لڑکی سادہ سے انداز میں بیٹھی ہوئی تھی ، اُس کی بڑی بڑی خوب صورت انکھیں ، حیرت و استعجاب کے مارے ، پردے کے شان دار مناظر پر گڑی ہوئی تھیں ۔ تھیٹر کے ایک خادم نے جب اُس سے کہا کہ پیچھے چلی جا ، یہاں صاحبوں میں نہ بیٹھ ! تو اُس کا حسین خواب ٹوٹ گیا ۔ با دلِ نخواستہ وہ اُٹھی ۔ معلوم ہوتا تھا کہ پہلی مرتبہ کھیل دیکھنے آئی ہے ۔ رنگین پردے پر سے اپنی نظریں ہٹائے بغیر وہ پیچھے چلی گئی ۔

پونے دس بجے گھنٹی بجنے کی آوازیں آئیں ۔ لو پردہ اٹھتا ہے ۔ خوش و خرم تماشائیوں کے سامنے اب ایک خوب صورت پائیں باغ کا منظر کھلا ہے جس کے ایک گوشے میں آرام دہ صوفے پر ہندوستان کا شہزادہ گلفام محو استراحت ہے ۔ اچانک گولے کی آواز آتی ہے اور ایک سبز رنگ کے زرق برق لباس میں ملبوس پری اوپر سے نیچے اُترتی ہے اور وہ بھی ایک (ایسی) رسی کے سہارے جو سب کو نظر آ رہی ہے ۔ شہزادے کی آنکھ اب بھی نہیں کھلتی اور سبز پری کہ یہی اُس کا نام ہے، اُس کے مردانہ حسن پر فریفتہ و دل گرفتہ اُس کے گرد گھومنے لگتی ہے ۔ وہ گانے اور ناچ (مشرق کے مخصوص چھوٹے چھوٹے ، ہلکے ہلکے خواہشوں سے بھرے ہوئے قدموں کے ساتھ) کے ذریعے اور ستار طبلوں کے نہ دکھائی دینے والے آرکسٹرا کی وساطت سے اپنے محبت بھرے جذبات کا اظہار کرتی ہے ۔

اگلا منظر راجا اندر کے دربار کا ہے ۔ راجا اپنے تخت پر

بیٹھا ہوا ہے - درباری اور خدمت گزار اس کے دائیں بائیں
موجود ہیں - پس منظر میں دو شاخہ بجلی کوند رہی ہے ،
سورج ، ستارے(!) ہیں ، پہاڑوں کے سلسلے ہیں ، اور یہ سب کچھ
مصور نے اس انداز میں بنایا ہے کہ حقیقی دنیا میں وہ کہیں
موجود نہیں - اپنے بیش قیمت تخت پر بیٹھا ، راجا کسی قدر
اداس ، مغموم اور پریشان نظر آتا ہے - چھپے ہوئے اشتہار کی
رو سے (راجا) اندر بہشت اور دیوتاؤں کا راجا ہے - جب اس نے
ایک جن کو حکم دیا کہ رقاصہ کو طلب کیا جائے تا کہ وہ
ہمارا دل بہلائے ، تو مجھے کوئی حیرانی نہ ہوئی - حکم کی دیر
تھی کہ فرشی دروازے کی طرف سے ایک پری نمودار ہوئی -
اس نے بھڑکیلے اور زرق برق کپڑے پہنے ہوئے تھے ، طرح طرح
کے قیمتی زیورات و جواہرات ، جن میں کنگن اور پازیب بھی
شامل تھے ، لیکن اس کے پیروں میں جوتے نہیں تھے - اپنے
پائل کی جھنکار کے ساتھ اس نے رقص کیا ، بلکہ یوں کہنا
چاہیے کہ سبک رفتاری سے راجا کے سامنے چلی اور ہلکی ہلکی
موسیقی کی آوازیں اس کے پیروں سے نکلتی رہیں - پیر فرش سے
آدھ انچ بھی اوپر نہیں اٹھتے تھے ، جسم بڑی نزاکت سے ہلتا
تھا اور وہ اپنے ہاتھوں کو اوپر عجب شان سے لے جاتی اور
نیچے لاتی تھی - اس کے لباس ، حرکات و سکنات اور انداز و
ادا کا مقابلہ یورپ کی سٹیج پر ایک پیر کے بل ناچتی ہوئی ،
تھرکتی ہوئی چست و چالاک ، پھرتیلی ، مستعد رقاصہ سے کرنا
درست نہیں ہوگا ، جب کہ یہ بھی ہمارے علم میں ہو کہ پری
بہر حال ایک مرد تھا اور اشتہار میں اس کا نام "ماسٹر ہومی"
لکھا ہوا تھا - تماشائیوں نے بڑھ چڑھ کر اس کے رقص پر داد کے
ڈونگرے برسائے - راجا اندر بھی اس قدر خوش ہوا کہ اس نے

چاہا کہ اس طرح کی مزید تفریح کا سامان مہیا کیا جائے ۔ چنانچہ حکم کی تعمیل ہوتی ہے اور تین پریاں یکے بعد دیگرے راجہ کے حضور اپنے اپنے فن کا مظاہرہ اور داد و تحسین حاصل کرتی ہیں ۔ مجھے یہ منظر بڑا طویل ، طفلانہ اور تھکا دینے والا لگا ، کیونکہ اس میں ڈراما سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ پریاں ایک کے بعد ایک ، فرضی دروازے سے اوپر آتی تھیں اور راجا کا دل لبھانے کے لیے گاتی اور ناچتی تھیں ۔ میرے لامانوس کانوں کو پائل کی آواز اور موسیقی کی دھن ہمیشہ ایک جیسی لگتی تھیں ، اور جہاں تک میں سمجھ سکا ، جذبات میں بھی کوئی انوکھا پن نہیں تھا ، یکسانیت تھی ۔ لیکن نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی ۔ تماشائیوں کو میں نے دیکھا ، وہ تو ٹوٹے پڑے تھے ۔ اُن کا زاویہ نظر مجھ سے بالکل مختلف تھا ۔

راجا اندر کے شاندار استقبالیہ کمرے کی جگہ اب ایک چھوٹے سے کمرے نے لے لی ، جس میں غریب سبز پری شہزادہ گلفام کی محبت کی ماری ، دربار کے ایک جن کو ترغیب دے رہی تھی کہ وہ اس کی خاطر شہزادے کو اٹھا لائے ۔ جن نے ابھی اُس کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی رضا مندی کا بھی اظہار نہ کیا تھا کہ ہوا میں معلق گلفام کا جو اب بھی محو استراحت ہے ، سوفا نمودار ہوتا ہے ۔ جن اُسے جگانا اور خود کو غائب کر لیتا ہے ۔ مسحور اور ششدر شہزادہ اپنے نئے ماحول پر حیران پریشان ہے اور محسوس کرتا ہے ، جیسا کہ مشرق میں اس قسم کی صورت حال پیش آنے پر ہر ایک محسوس کیا کرتا ہے کہ وہ کسی جادوگر کے جال میں پھنس گیا ہے ۔ سبز پری نمودار ہوتی اور اس کی دل جمعی کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی ہے ۔ انتہائی بے تکلفانہ ، بے حجابانہ ، بے باکانہ

محبت کا اظہار کرتی ہے[1] ، لیکن شہزادے کا دل کسی طرح نہیں پسیجتا ۔ ایک تو نیا ناساز گار ماحول ، دوسرے اسے اپنا ہندوستان رہ رہ کر یاد آتا ہے ۔ چنانچہ وہ سرد مہری سے اس کی محبت کا جواب دیتا ہے ۔ لیکن جب اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پری راجا اندر کے دربار سے آئی ہے تو اس میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ آسمان کے عجائبات دیکھے ۔ چنانچہ وہ محبت کے بدلے محبت دینے کا وعدہ کر لیتا ہے ، بشرطیکہ وہ اسے آسمان پر لے جائے ۔ لیکن ایک فانی آدم زاد کو اہل آسمان میں لے جانا ایک بہت مشکل کام تھا جس کی راہ میں قدم قدم پر دقتیں حائل تھیں ، اس لیے سبز پری کہتی ہے کہ میں تمھاری بس یہی خواہش پورا نہیں کر سکتی ۔ اب شہزادہ ایک اور چال چلتا ہے ۔ وہ پری سے کہتا ہے ، تم راجا اندر کے دربار کی پری ہونے کا دعویٰ کرتی ہو اور میرا خیال ہے کہ تم کسی بدبخت ، راندۂ درگاہ جن کی داشتہ ہو ۔ یہ سن کر سبز پری کو طیش آ جاتا ہے اور وہ خفگی کا اظہار یوں کرتی ہے کہ اپنے عاشق دل پذیر کے ایک مکا رسید کرتی ہے اور کہتی ہے کہ کوئی آدم زاد راجا اندر کے دربار میں قدم بھی نہیں رکھ سکتا ۔ اُدھر گلفام کو جیسے ضد ہو گئی ہے ۔ وہ کہتا ہے ، میری طرف

---

۱ ۔ اس قسم کا اظہار محبت موجودہ ہندوستانی تماشائیوں کو محظوظ کرنے کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے ۔ محبت میں مبتلا عورتوں کو اپنا محبوب حاصل کرنے کی تگ و دو میں انتہائی بے باک اور بے حجاب دکھایا جاتا ہے ۔ وہ سخت ترین جھڑکیوں کے باوجود اُس کی تمنا سے باز نہیں آتیں ۔ اس مضمون کے آخر میں ''پورن بھگت'' کی کہانی اس کی ایک مثال ہے ۔ (مضمون نگار)

سے محبت کی یہی ایک شرط ہے ۔ آخر کار بے چاری عشق کی ماری سبز پری اپنے محبوب کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیتی ہے اور لے جا کر اُسے ایک ایسی جگہ پر چھپا دیتی ہے جہاں کوئی اُسے نہیں دیکھ سکتا ۔ لیکن وہ خود دربار کا پورا نظارہ کر سکتا ہے ۔

دربار میں معمول کے مطابق ناچ گانا ہو رہا تھا کہ ایک خادم ، آدمی کی بو سونگھ لیتا اور اُسے پکڑ کر کھینچتا ہوا راجا اندر کے حضور میں پیش کرتا ہے ۔ مشتعل اور نیک مزاج اندر کی عدالت سے جس فیصلے کی اُمید ہو سکتی تھی ، وہی صادر ہوا ۔ عاشق مزاج پری کے پر کاٹ کر اُسے جلا وطن کر دیا جاتا ہے اور شہزادہ گلفام کو یہ سزا دی جاتی ہے کہ وہ باقی کی ساری زندگی ایک کوئیں میں قید تنہائی میں کاٹے ۔

آخری ایکٹ میں یہ ساری بگڑی ہوئی باتیں ٹھیک ٹھاک ہو جاتی ہیں ۔ ایک جوگن کا حسن اور اُس کی آواز کا جادو اس قدر مشہور ہوا کہ خبر راجہ تک پہنچی ۔ اُس نے اُسے اپنے دربار میں بلایا ۔ وہ آتی ہے اور اپنی دل پذیر شخصیت اور پر اثر آواز اور درد بھرے گیت سے دیوتا کو مسحور کر لیتی ہے ۔ صلے اور انعام کے طور پر راجا اندر اسے کئی تحفے دیتا ہے ، لیکن وہ ہر ایک واپس کر دیتی ہے ۔ آخر وہ کہتا ہے کہ تم جو مانگو گی ، وہی دوں گا ۔ جوگن نے خوش ہو کر کہا : ”مجھے گلفام دے دو“۔ یہ جوگن سبز پری ہے اور شہزادہ گلفام اب اُس کے محبت بھرے بازوؤں میں ہے ۔

اوپر جن دو کھیلوں کا میں نے ذکر کیا ہے ، اُن میں سے ”الہ دین کا چراغ“ اگرچہ اپنے مزاج اور ماحول کے اعتبار سے مشرقی تھا اور اس کا بیش تر حصہ فوق الفطرت پر منحصر

تھا، لیکن وہ ایک ایسی کمپنی نے کھیلا جس کے افراد یورپی طرز اور اسلوب سے متاثر تھے ۔ چنانچہ انھوں نے کھیل میں دل چسپی اور گرما گرمی پیدا کر دی ۔ "اندر سبھا" میں گانا اور اداکاری غیر دل چسپ ، بے لطف اور مصنوعی تھی ۔ اس میں نہ جان تھی نہ حرکت، نہ عمل، نہ اظہار ۔ لیکن جیسا میں نے پہلے بھی کہا ہے ، دیکھنے والوں کے مذاق اور پسند کے عین مطابق تھا ۔ موسیقی اچھی تھی اور کبھی کبھی میرے کانوں کو بھی خوش گوار لگتی تھی ، حالانکہ میرے کان مشرقی سر اور آہنگ کے رموز و اسرار سے ناآشنا ہیں ؛ یہ کھیل ایک طربیہ گانے پر ختم ہوا تھا جو یقیناً بڑا نفیس اور پر اثر تھا اور تماشائی اس سے لطف اندوز ہوئے تھے ۔

لیکن "اندر سبھا" میں بعض خامیاں نمایاں تھیں ، مثال کے طور پر راجا کا دربار ؛ جب پردہ اٹھا اور ہمارے سامنے پر وقار انداز میں بہترتیب تخت پر براجمان راجا اور اس کے درباری نظر آئے تو مجھے خود بخود "کٹھ پتلیوں کا تماشا" یاد آ گیا ۔ بیش تر اینگلو انڈین بچوں نے یہ تماشا اکثر دیکھا ہے اور وہ اس سے نامانوس نہیں ہیں ۔ اس تماشے میں کئی زرق برق لباس میں ملبوس بادشاہ آتے ہیں اور شان و شوکت سے چمکدار تختوں کی قطار میں اپنے اپنے تخت پر بیٹھ جاتے ہیں ۔ ہر بلند مرتبہ اور پر جلال بادشاہ نہ دکھائی دینے والے تار میں بندھا ، استقبالیہ ہال میں آتا ہے اور تماشا دکھانے والا ہر بادشاہ کو پکار پکار کر مناسب اعزازات و خطابات سے نوازتا رہتا ہے ۔ بالآخر سب سے بڑا بادشاہ آتا ہے اور وسط میں اپنی نشست پر آ کر بیٹھتا ہے ۔ طبلے والا زور زور سے اپنا طبلہ بجاتا رہتا ہے ۔ پھر سب نشستیں پر ہو جاتی ہیں ان کا آنا اور ان کا جانا ان

کے خطابات کی طرح مصنوعی اور مضحکہ خیز تھا ۔

ایک اور کھیل کا آنکھوں دیکھا حال یہاں بیان کرتا ہوں ۔ اس کھیل کے اخراجات ایک کامیاب تاجر نے حصول ثواب کی خاطر برداشت کیے تھے ۔ اپنے قصبے کے لوگوں کے مفاد اور بھلائی کے لیے اس نے ایک اخلاقی سوانگ رچایا ، اس امید پر کہ اسے مذہبی طور پر ثواب ہوگا اور یہ ایک نیکی کا کام ہوگا ۔ داخلہ مفت تھا ، اس لیے حاضرین منتخب نہ تھے ۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ یہ کھلا ماحول انتہائی منظم ، پر امن اور شائستہ تھا ۔ ادا کاروں کے لیے سٹیج تھی ، لیکن تماشائیوں کے لیے کوئی سیٹ نہ تھی ۔ وہ اطمینان سے آلتی پالتی مارے ، ٹاٹ کے فرش پر بیٹھے ہوئے تھے ۔ سر کے اوپر خوب صورت ستاروں بھرا آسمان کا چھتر تھا اور ہندوستان میں موسم گرما کی تاریک رات میں اس سے بہتر ہال اور کوئی نہیں ہو سکتا ۔

پرھلاد کا ڈراما :

ہندوستان کے زیادہ مقبول ڈراموں میں سے ایک "پرہلاد" ہے ۔ میں ساڑھے نو بجے کھیل دیکھنے گیا اور تقریباً آدھی رات کو واپس آ گیا ، حالانکہ ابھی کھیل صرف آدھا ختم ہوا تھا ۔ پہلا منظر ہمیں کمہار کے آوے پر لے جاتا ہے ۔ چند گھریلو استعمال کے برتن ، چراغ اور چلم وغیرہ ایک عورت کی نگرانی میں آوے میں پکائے جانے والے تھے ۔ اس عورت نے ایسے خوب صورت اور قیمتی کپڑے پہن رکھے تھے کہ عموماً ایک کمہارن عام زندگی میں ایسے اچھے کپڑے نہیں پہنتی ۔ کمہار کے آوے میں ایک بلی نے چار بچے رکھ دیے

تھے ۔ پرہلاد (راجا کے بیٹے) کا اتفاق سے اُدھر سے گزر ہوا اور اس نے آوے میں بلی کے بچے دیکھے تو اس نے کمہارن سے کہا ، "ان بے زبان بچوں کو آگ جلانے سے پہلے ہٹا لے ورنہ یہ جل کر مر جائیں گے" ۔ کمہارن نے کہا "اگر رام کی مرضی یہی ہے کہ یہ زندہ رہیں تو یہ اوے کی دہکتی آگ میں بھی زندہ رہیں گے" ۔ پرہلاد بولا "رام ! کون رام ! میرے ابا مہاراج اس سے کہیں زیادہ بڑے ہیں[1] ، لیکن میرے ابا بھی دہکتی آگ سے ان کو نہیں بچا سکتے" ۔ کمہارن نے جواب دیا "اچھا دیکھیں گے" ۔

چار روز تک مسلسل آگ جلتی رہی ، لیکن عجیب بات ہے کہ بلی کے بچوں کو آنچ تک نہ آئی ۔ یہ دیکھ کر پرہلاد رام پر ایمان لے آیا اور اس کا سچا عاشق اور دیوانہ بن گیا ، اور علی الاعلان تسلیم کر لیا کہ رام میرے بادشاہ باپ سے بھی بڑا ہے ۔ ماں نے اپنے بیٹے کو رام کی پوجا میں اس قدر مستغرق پایا تو مشتعل ہوگئی اور اس کی اصلاح کی خاطر اسے ایک برہمن سکول ماسٹر کے سپرد کر دیا ۔ لیکن رام سے پرہلاد کی محبت میں کوئی فرق نہ آیا ۔ ہر وقت "رام رام" جپتا رہتا تھا ۔

برہمن کے سکول کا منظر پیش ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ تماشائیوں کو ہنسایا جائے ۔ واقعی اچھا منظر تھا ۔ لڑکے

---

[1] ۔ نوجوان شہزادے کی یہ شیخی غلط نہیں تھی ، کیوں کہ اُس کے باپ "ہرنا کسپو نے آسانی دیوتاؤں سے لڑائیاں لڑی تھیں اور دیوتاؤں کے دیوتا اندر سے آسمان کی بادشاہت چھین لی تھی اور وہاں عیش کی زندگی بسر کرتا تھا" ۔
(پروفیسر ڈوسن کی ہندو دیومالا کی کلاسیکی ڈکشنری) ۔
مضمون نگار

ماسٹر جی کی پشت پر باری باری کھانستے تھے اور اس کا منہ چڑاتے تھے - پرہلاد نے لڑکوں کی ان گستاخانہ شرارتوں میں کوئی حصہ نہ لیا ، بلکہ بلند آوازے سے "رام رام" جپتا رہا - اس پر ماسٹر نے کئی بار اسے اپنی مضبوط بید کا مزہ چکھایا ، لیکن کسی طور اس کے اصلاح کا پہلو نہ نکلا - اس باغی اور بے قابو شاگرد سے تنگ آکر ماسٹر بادشاہ کے پاس پہنچا اور صاف صاف اقرار کیا کہ یہ میرے بس کا روگ نہیں ، آپ جانیں آپ کا کام - اب بادشاہ نے اسے خود درست کرنے کی ٹھان لی ، اور جب ہر طرح کی دلیل اور ہر قسم کی ترغیب اسے راہ راست پر لانے میں ناکام ثابت ہوئی تو اس نے اسے موت کے گھاٹ اتارنے کا حکم دیا - پاک دامن اور نیک شہزادہ ، رام کا سچا عاشق اب پھانسی کے تختے پر چڑھنے والا تھا اور اسے فی الحقیقت ہمارے سامنے پھانسی پر چڑھا دیا گیا ، لیکن رسی ٹوٹ گئی - بل نہ گیا تو اسے پہاڑی پر سے گرایا گیا ، مگر اسے خراش تک نہ آئی - جلاد نے تلوار اس کی گردن پر ماری، مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا - جب صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو راجہ نے غضب آلود ہو کر اپنی تلوار میان سے نکالی اور گستاخ بیٹے کی گردن پر مارنے کے لیے کھینچی - عین اس لمحے زمین شق ہو گئی اور وشنو (رام) ایک خوف ناک شیر کی شکل میں سٹیج پر نمودار ہوا اور گمراہ راجہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے - کیا دنیا کی کوئی اور چیز اس سے زیادہ مذہبی ، اخلاقی اور خالص ہندوستانی ہو سکتی ہے ؟

اس مذہبی و اخلاقی ڈرامے میں جہاں تک اداکاری کا تعلق ہے ، یہی بہت کافی تھا کہ قدم قدم پر تماشائیوں کو ہنسایا جائے - اگرچہ تماشائی اپنی مذہبی توجہ اور تقدس کی وجہ سے

اس سے بہت زیادہ متاثر معلوم ہوتے تھے ۔ پہلے منظر میں جب پرہلاد اور کمہارن کے مابین گفتگو ہوتی ہے تو بولنے والا ، خواہ وہ پرہلاد ہو یا کمہارن ، بہر صورت سٹیج کے بائیں ہاتھ والے کونے میں جا کھڑا ہوتا تھا ، کیوں کہ وہاں پردے کے پیچھے پرومپٹر چھپا ہوا تھا ۔ جب راجکمار کو بولنا ہوتا تھا تو وہ آہستہ آہستہ بائیں ہاتھ کی طرف آتا اور کمہارن آہستہ آہستہ دائیں طرف کو چلی جاتی تھی ۔ جب وہ اپنی بات ختم کر چکتا تو وہ حسب سابق اپنی جگہیں تبدیل کر لیتے ــــــ آہستہ آہستہ اور اپنی شان اور انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے ۔ اگرچہ جگہ کا یہ مضحکہ خیز رد و بدل بڑی دیر تک ہوتا رہا ، لیکن تماشائیوں میں سے ایک شخص بھی اس سے حوش نظر نہ آتا تھا ۔

چونکہ اس مختصر سے مضمون کا مقصد آج کے ہندوستان اور بالخصوص پنجاب کے مقبول ڈراموں کا ایک سرسری جائزہ ، خواہ وہ کتنا ہی ناکافی اور غیر مکمل ہو ، پیش کرنا ہے ، اس لیے یہاں میں 'پورن بھگت' کا اشتہار جوں کا توں نقل کرنے کی کوئی معذرت یا تاویل وغیرہ نہیں دوں گا ، کیوں کہ بہر صورت اس سے مشرقی زندگی کے حالات و اطوار اور ڈرامے کے موضوعات کو سمجھنے میں مدد ملے گی ۔

پورن بھگت :

اس کھیل کے بارے میں ایک اشتہار چھاپا گیا تھا جو یہاں نقل کیا جاتا ہے :

"یہ کھیل جو صوبے کے ہر مرد و زن کے ہونٹوں پر ہے ، نہایت خوش اسلوبی سے پنجابی کی ایک سچی کہانی

سے مناسب تبدیلیوں کے ساتھ ترجمہ کیا گیا ہے ۔ اس کا لب لباب یہ مشہور ضرب المثل ہے کہ "خون سر چڑھ کر بولتا ہے ۔" مصنف نے بڑی خوبی سے یہ حقیقت اجاگر کی ہے کہ قاتل کا سیاہ کارنامہ کچھ دیر کے لیے چھپا رہ سکتا ہے لیکن بالآخر خدا ، جو کرتی چڑیا بھی مخلوق کو دکھا دیتا ہے ، اپنی کسی نہ کسی تدبیر سے قاتل کو سامنے لے آئے گا اور اسے سزا بھی دے گا ۔ بدی پر نیکی کی فتح ایسے پر اثر انداز میں دکھائی گئی ہے کہ اس سے پہلے آپ نے کبھی نہ دیکھی ہوگی ۔

سیالکوٹ میں ایک راجا سالباہن تھا جس کی ملکہ کا نام لونا تھا ، اور یہ ایک موچی کی بیٹی تھی ۔ وہ بہت حسین و جمیل تھی، لیکن ظالم اور نفس پرست بھی کچھ کم نہیں تھی ۔ راجا کے اس ملکہ سے کوئی اولاد پیدا نہ ہوئی ۔

البتہ پہلی ملکہ سے ایک لڑکا تھا جس کا نام پورن تھا ۔ راجا سالباہن کو لونا سے اس قدر محبت تھی کہ جب سے اس نے شادی کی تھی ، تو پہلی ملکہ کی شکل تک نہ دیکھی تھی ۔ ایک دن راجا نے اپنے بیٹے پورن کو حکم دیا کہ اپنی سوتیلی ماں کی خدمت میں پیش ہو کر قدم بوسی کرے ۔ شہزادے نے اپنے والد کا حکم بجا لانا چاہا ، لیکن ماں نے نصیحت کی کہ لونا سے بچ کر رہنا ، کیوں کہ وہ سازشی طبیعت کی عورت ہے ۔ بہر حال اس نے باپ کے حکم کی تعمیل کی اور لونا کے پاس گیا ۔ لونا نے بڑی محبت اور شفقت سے اس کا خیر مقدم کیا ، خاطر تواضع کی ۔ ہوا یوں کہ ملکہ لونا اس پر فریفتہ

ہو گئی اور وہیں پہلی ملاقات ہی میں اپنی آتش دروں کا ذکر بھی کر دیا ۔ پورن نے نفرت سے انکار کر دیا ۔ لونا کو جب اپنی خواہشات کی تکمیل میں شکست ہوئی تو اُس نے جھلا کر پورن پر الزام لگایا کہ سخت بداطوار ہے ، اُس نے میری توہین کی ہے اور میرے وقار اور عزت کو نقصان پہنچایا ہے ۔ جب راجا اپنے محل میں آیا تو دیکھا کہ اُس کی چہیتی ملکہ سخت اداس و مغموم بیٹھی ہے ملکہ نے ساری کہانی کہہ سنائی ۔ راجا نے اُس کی باتوں پر یقین کرتے ہوئے پورن کو قید تنہائی کی سزا دی ۔ لونا جو عشق کی آگ میں بھن رہی ہے ، چاہتی ہے کہ پھر پورن سے ملے اور اُسے کسی طرح ورغلائے تاکہ وہ اُس کی تسکین کرے ۔ راجا سے اجازت لینے کے بعد وہ قید خانے جاتی ہے ۔ بہانہ یہ ہے کہ وہ پورن کو نصیحت کرے گی کہ اپنی بد اخلاقی اور بد نیتی سے باز آئے ۔ لیکن نصیحت کرنے کی بجائے وہ اُسے الٹا یہ سمجھاتی ہے کہ میری خواہش پوری کرو ۔ میں تمھارے حسن پر مر مٹی ہوں ۔ شہزادہ صاف انکار کر دیتا ہے ۔ بادشاہ اور اُس کی پہلی بیوی یہ سب کچھ چھپ کر سن رہے تھے ۔ اب لونا نے جو یہ دیکھا کہ بادشاہ نے ہماری باتیں سن لی ہیں ، تو ایک دم بدل کر عاشق سے ماں بن گئی ، اور پورن سے اس انداز میں باتیں کرنے لگی جیسے وہ تو ماں کی محبت کی بات کر رہی تھی ، اور پورن نے اب بھی انکار کیا تو گویا لونا نے شوہر کو ثابت کر دکھایا کہ پورن کے دل میں اب تک برائی ہے اور وہ اس کی عزت لینا چاہتا ہے ۔ بادشاہ کے طیش کی

حد نہ رہی ۔ وہ حکم دیتا ہے کہ پورن کو کنویں میں پھینک دیا جائے ۔ بھلی ملکہ ، پورن کی ماں کوشش کرتی ہے کہ پورن کو معاف کر دیا جائے ، لیکن بادشاہ اُس سے بھی خفا ہو جاتا ہے ، اور اُسے جنگلوں میں چھوڑ دیتا ہے ۔

چند جوگیوں کا اُدھر سے گزر ہوا تو انھوں نے پورن کو کنویں سے نکال لیا ۔ پورن اُن کے ساتھ شامل ہو کر گویا فقیر اور بھگت بن جاتا ہے ۔ وہ ایک روز ایک شہر میں بھیک لینے کے لیے جاتا ہے ۔ ایک ایسے گھر سے بھیک مانگتا ہے جس کی مالکہ ایک یتیم مگر رئیس عورت سندرا ہے ۔ سندرا کو اُس پر ترس آ جاتا ہے اور وہ اُس کی محبت میں مبتلا ہوجاتی ہے اور پورن سے کہتی ہے کہ میری مخلصانہ محبت قبول کر لو ۔ پورن بھگت اس سے کہتا ہے کہ اس ناپاک جذبے سے باز رہو ۔ وہ ملتجیانہ انداز میں اصرار کرتی ہے ۔ عین موقع پر پورن کا استاد جوگی آ جاتا ہے اور وہ پورن کو نصیحت کرتا ہے کہ دنیا کی خوشیوں اور لذتوں سے کنارہ کشی کرو ۔ پورن چلا جاتا ہے اور اُس کے پیچھے پیچھے سندرا بھی جوگن کا بھیس بدل کر جنگلوں میں نکل جاتی ہے ۔

ایک رات راجا سالباہن خواب میں کیا دیکھتا ہے جیسے پورن کا استاد جوگی آیا ہے اور اُس پر لونا کی سازشیں اور پورن کی بے گناہی ظاہر کرتا ہے ۔ جوگی اپنی روحانی طاقت کے زور سے ، سزا کے طور پر راجا کو اندھا کردیتا ہے اور اس کا علاج یہ تجویز کرتا ہے کہ اپنے ہاتھ لونا کے خون میں دھوئے تو آنکھیں کھل جائیں گی ۔

جنگلوں میں ایک طرف پورن کی ماں ماری ماری پھر رہی ہے اور دوسری طرف بے چاری سندرا ۔ ایک دن اتفاق سے دونوں مل جاتی ہیں اور اپنا اپنا دکھڑا بیان کرتی ہیں ، اور ایک دوسرے کو پہچان بھی لیتی ہیں ، لیکن اپنا اپنا نام ظاہر نہیں کرتیں ۔

راجا کو اپنی حماقت کا پورا پورا احساس ہو چکا ہے اور اب وہ بیٹے کا بدلہ چکانا چاہتا ہے ، اور وہ بھی یوں کہ لونا کی زندگی ختم کر دی جائے ۔ اس موقع پر پورن بھگت آتا ہے اور اپنے باپ سے درخواست کرتا ہے کہ لونا کو معاف کردیا جائے ۔ جوگی اصرار کرتا ہے کہ اس کا خاتمہ کرنا بہتر ہے ، لکن پورن کے بہت زیادہ دباؤ اور التجا پر لونا کو معاف کر دیا جاتا ہے ۔ لونا اپنے قصور کی صدق دل سے معافی مانگتی ہے ۔ جوگی راجا سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ اس کی آنکھیں کسی اور طریقے سے ٹھیک کر دے گا ۔ وہ پورن کو بھیجتا ہے کہ جا کر اپنی ماں کو تلاش کر کے لائے ۔ پورن بڑی مشکلوں کے بعد جنگلوں میں ماں کو ڈھونڈ لیتا ہے جس کے ساتھ ایک جوگن سندرا بھی ہے ۔ مضطرب و پریشان راجا کو تمام دکھوں سے نجات ملتی ہے ۔ وہ پورن کا بیاہ سندرا سے کر دیتا ہے، اور ایک خوشگوار اور طربیہ گیت کے ساتھ پردہ گرتا ہے ۔"

اب تک میں نے ان کھیلوں کا مختصراً ذکر کیا ہے جو حالی ہندوستان میں مقبول و معروف ہیں ۔ میں نے ایک جدید قسم کا ''اپٹوڈیٹ'' معتدل ڈراما بھی دیکھ رکھا ہے ۔ شکسپیئر کے بھی اکثر ڈراموں کا اردو میں آزاد ترجمہ کیا لیا ہے ،

جو نئے ناموں اور نئے ساز و سامان کے ساتھ عمدگی سے کھیلے گئے ہیں ۔

جہاں تک زندہ دل اور زود فہم بنگالیوں کا تعلق ہے ، وہ ڈرامے اور اداکاری کے عاشق ہیں اور دیومالائی ڈرامے کی مقبول شکل "یاترا" سے بہت لطف اندوز ہوتے ہیں ۔ ان کے ہاں صرف خواتین کی تفریح طبع کے لیے "پنجلی" بھی ہے جو زنان خانوں میں صرف خواتین اداکار کھیلتی ہیں ۔ بنگال کے جدید ڈرامے کے متعلق ایک بنگالی مصنف نے لکھا ہے کہ اس کی بنیاد انگریزی تعلیم کے روح پرور اثرات پر ہے ۔ انگریزی تعلیم سے پرانی سنسکرت کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا ۔ بنگال کے جدید ڈرامے کا آغاز ۱۸۵۷ع کے ہنگامہ خیز سال سے ہوا ، جب پہلی مرتبہ سنسکرت کے ڈرامے 'شکنتلا' کا بنگالی ترجمہ شملے میں بابو آستوش دیو کے مکان پر کھیلا گیا ۔ حقیقت یہ ہے کہ سرکاری اور مشنری کالجوں میں شکسپیئر اور انگریزی کے ڈرامائی لٹریچر کے مطالعے سے بنگالیوں کو تحریک ہوئی کہ وہ سنسکرت کے پرانے اور فراموش شدہ ڈراموں کو آج کی زبان میں ترجمہ کریں ، اور اس تحریک کے زیر اثر بہت سے طبعزاد المیہ اور طربیہ ڈرامے بھی وجود میں آئے ۔ جدید بنگلہ ڈرامے کی ولادت کے ساتھ ہی سرکاری و عوامی تھیئٹر بھی وجود میں آ گئے جو جدید یورپی طرز پر بنائے گئے ہیں ۔

جیسا کہ میں نے اس مضمون کے شروع میں بھی ذکر کیا تھا ، میں بنگالی تھیئٹر کے بارے میں مشاہداتی علم نہیں رکھتا ۔ ان تھیئٹروں میں سے ایک اشتہار جو میرے ہاتھ لگا ہے ، اس قدر دلچسپ اور معلومات افزا ہے کہ یہاں اپنے قارئین کے مطالعے کے لیے جوں کا توں نقل کرتا ہوں ۔ یہ لاہور کے

ایک اخبار میں چھپا ہے - اس میں طباعت کی کچھ غلطیاں بھی ہیں جو میں نے دانستہ درست نہیں کی ہیں :

"ہفتہ اور اتوار - ۲۸ اور ۲۹ مئی
نیشنل تھیٹر - ۶ ، بیڈن سٹریٹ
ہفتہ ۲۸ مئی ، ۱۸۸۱ع

نو بجے شب کو مناسب تبدیلوں اور مزید اضافوں کے ساتھ بابو گریش چندر گھوش کا وہ نیا اور طبع زاد تاریخی ڈراما پیش کیا جائے گا جس کا نام ہے : آنندور ہو یا اکبر -
یہ نیا ڈراما کوئی باسی اور روکھی پھیکی کہانی نہیں ہے جسے لمبے لمبے فضول مکالموں میں بیان کیا گیا ہو۔ اس میں لمبی لمبی تقریروں اور بے کار خود کلامیوں کی بھرمار بھی نہیں ہے - عظیم سیاست داں اور زبردست حکمراں شہنشاہ اکبر کی شخصیت کی ترجمانی ایک سچے ڈراما نگار نے کی ہے -
دم توڑتے ہوئے ، آخری ہچکیاں لیتے ہوئے رانا پرتاب کی آخری درد انگیز تحریر سے اُس شخص کے بھی آنسو نکل آئیں گے جس کے سینے میں پتھر کا دل ہے -
اور وہ منظر تو بلا شبہ قیامت خمز ہے جس میں اکبر کو زہر کے اثرات میں مبتلا دکھایا جاتا ہے جیسے وہ اپنے جال میں خود پھنس گیا ہو - بادشاہوں کا بادشاہ جس کے ادنلی سے اشارے سے اس وسیع و عریض سلطنت ہندوستان کی تقدیر زیر و زبر ہو جاتی تھی ، آج ایک تالاب کے وسط میں بنے ہوئے کمرے میں تن تنہا ، بے بس پڑا جہنم کے سے عذاب سہہ رہا تھا - آج وہ اپنے

سوکھے حلق میں ایک بوند پانی بھی نہیں ڈال سکتا ۔ یہ دردناک مگر عظیم الشان منظر، دیکھنے والوں کے ذہن پر ایسا گہرا اور مستقل نقش چھوڑے گا کہ کبھی مٹائے نہ مٹے گا اور سچائی کا یہ ناقابل فراموش سبق سکھائے گا کہ پالیسی کا ٹیڑھا میڑھا راستہ ہمیشہ خطرناک ثابت ہوتا ہے ۔

بیتال : یہ خالص طبع زاد اور شاندار اور بلند قومی کردار خود بابو گریش چندر گھوش ادا کریں گے ۔

روح پرور گانے : جن میں مذہب اور عشق یک جان و دو قالب ہو گئے ہیں ۔ ایسے دل کش گانے جن کے بول سن کر بڑے سے بڑا دہریہ بھی خدا پر ایمان لے آئے گا ۔

مناظر : اور جہاں تک ہمارے شاندار اور رنگا رنگ منظروں کا تعلق ہے ، ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ "آئیے اور خود ملاحظہ کیجیے ۔"

اگلے دن کا پروگرام : اتوار کو چھ بجے ، وہ عظیم الشان میلو ڈراما :

جادو کا مجسمہ پیش کیا جائے گا جس کے متعلق تمام مقامی اخبارات نے اچھے تبصرے کیے ہیں اور ہماری محنت ، ہماری اداکاری اور ہماری سٹیج کی دل کھول کر داد دی ہے ۔

یاد رکھیے، یہ وہی ناقابل فراموش کھیل ہے جس کے آخر میں سنگ مرمر کے مجسمے خوب صورت انسانی شکلیں اختیار کر لیتے ۔" جی سی گھوش (منیجر)

بنگالی ڈرامے کا یہ مخصوص اشتہار اپنی مخصوص اخلاق اداں کے ساتھ اپنی وضاحت خود کر رہا ہے اور اس پر حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں۔

(از جان کیمبل اومان پروفیسر طبیعیات گورنمنٹ کالج لاہور مطبوعہ ۱۸۸۵ء۔ ترجمہ سید قاسم محمود برائے صحیفہ بابت جولائی ۱۹۶۷ء)